سخن زاد

ارشد جمال صارم

ارشد جمال صارمؔ کی غزلوں کا تخلیقی شجرہ نائخ سے
جاملتا ہے۔ان کے یہاں سیدھے ،سپاٹ بیانیہ کا گزر
نہیں ۔یہ غزلیہ متن حیات وکائنات کے تجربے اور مشاہدے کا
ایسا ثائیدہ ہے جو غزل کی رسومیات اور شعریات کے گہرے
شعور سے خلق پذیر ہوا ہے۔اس شاعری کا نمایاں میلان تخیلی
ندرت خیزی اور تشبیہ واستعارے کی جدت طرازی کا آمیزہ
ہے۔شعر سازی کا یہ پورا عمل دقتِ لفظ ،مشکل پسندی ،خیال
پرداختگی اور تراکیب کی ندرت وانفراد سے تشکیل پاتا ہے۔
یہاں سہل انگاری کا کوئی دخل نہیں ۔ان کے آہنگ کا جلال
وجمال قاری کو مسحور ومتنوم کردیتا ہے۔
شاعر وہی کامیاب ہے جس کا رنگ اوروں سے
جدا ،جس کی آواز اوروں سے الگ اور جس کا تیور اوروں سے
مختلف ہو۔اس حوالے سے ارشد جمال صارمؔ کامیاب شاعر
ہیں ۔ہماری پیڑھی میں ان کی سی خلاقی شاذ ہی دکھائی دیتی
ہے ۔وہ شعری شاہراہ پر اپنی اسی قوت کے سبب طویل
مسافت طے کرنے کے مجاز ہیں۔
ڈاکٹر خالد مبشر
جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

مکین یوں تو سخن زاد ہیں کئی مجھ میں
مگر وہ غم کہ جو کرتا ہے شاعری مجھ میں

سخن زاد

ارشد جمال صارمؔ

ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، نئی دہلی ۔ ۲۵

نام کتاب : سخن زاد (شعری مجموعہ)

شاعر : ارشد جمال صارمؔ

سرِورق : رئیس خلیل

کتابت : ابو فارس جمال

تزئین : شفیق انصاری

سن اشاعت : ۲۰۱۹ء

قیمت : ۲۰۰

ناشر : ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، نئی دہلی۔ ۲۵

مطبع : زاویہ پرنٹ، نئی دہلی۔ ۲۵

خط و کتابت کا پتہ

محمدیہ طبیہ کالج، منصورہ، مالیگاؤں، ناسک (مہاراشٹر)

موبائل نمبر: 7767993333

sarimnium@gmail.com

انتساب

نانا (مرحوم)

ماسٹر اعجاز احمد خان

کی یادوں کے نام

جن کا زندگی بخش والہانہ لہجہ
آج بھی گردو پیش میں روشنی بکھیر دیتا ہے

یہ کیوں ابھی سے لہو تھوکنے لگا ہے قلم
ابھی تو صرف کہانی کی ابتدا ہوئی ہے

فہرست

☆ ارشد جمال صارمؔ: اردو شاعری کا نادرہ کار شاعر: عرفان وحید 1

☆ سخن زاد کا تخلیقی وجدان: ڈاکٹر افتخار الحق 8

☆ مگر وہ غم کہ جو کرتا ہے شاعری مجھ میں: ارشد جمال صارمؔ 14

☆ **غزلیات**..................................

1 مجھے آئینۂ فکر و نظر دے 17

2 مکین یوں تو سخن زاد ہیں کئی مجھ میں 19

3 شام کے سرمئی آنچل سے ہویدا ہوگا 20

4 اک سفینۂ نور کا تاریک منظر میں اکیلا 22

5 ناگاہ نوچ کر ہی نہ رکھ دیں کہیں مجھے 24

6 خود آگہی سے اسے آشکارہ کر کے لا! 26

7 دنیا کو آسمان کی تھالی میں مل گیا 27

8 فکر کی پہنائیوں میں اڑ رہا ہوں چار سو 29

9 کہیں بھی وسعت افلاک میں نہیں ملتا 30

10 تمام عمر حصارِ گل و گہر رہتے 31

11 شعار کر کے چراغوں کی پیروی اس نے 32

12 کہاں کہاں سے سناؤں تمہیں فسانۂ شب 33

13 کوئی چراغ نہیں، گل نہیں، ستارہ نہیں 34

14 زندگی! تجھ سے کیا عہد نبھا سکتے ہیں 35

15 اتنا قرینِ دامنِ احساس کر لیا 37

16	ارادہ ہو جو تراشب کی مانگ بھرنے کا	38
17	معجزہ یہ دیکھتے رہتے ہیں ہم حیران سے	40
18	دکھاتی ہے جو یہ دنیا وہ بیٹھا دیکھتا ہوں میں	42
19	سخت احوال اگر ہم پہ ہُوا کرتے ہیں	43
20	پلٹ کر دیکھنے کا مجھ میں یارا ہی نہیں تھا	44
21	بخشتی ہے قرب اپنایوں بھی ویرانی مجھے	45
22	وقت کے تصرف میں یہ گھڑی بھی آئی تھی	46
23	ہیں کب سے ترے چاک پہ، مرجھائے بدن	47
24	دیکھتا رہ جاتا ہوں میں پیش وپس ہوتا ہوا	48
25	دو چار ستارے ہی مری آنکھ میں دھر جا	49
26	جانے کیا! جانے کی اس کو جلدی تھی	50
27	ہوا کا زور بھی اور دیپ کی امامت بھی	51
28	اضطراب ایسا ہوا دل کا سہارا مجھ کو	52
29	سوادِ چشم میں حیرت اگایئے تو سہی	53
30	سانسوں کو اعتبار عطا کر دیا گیا	54
31	گلاب نت نئے ہم زینت سبد کیے جائیں	55
32	فنا ہوا تو میں تارِ نفس میں لوٹ آیا	57
33	کہکشاؤں نے رفاقت کا ارادہ باندھا	58
34	نت نئے نقش سے باطن کو سجاتا ہوا میں	60
35	کسی کا عشق مری ذات پر حصار ہوا	61
36	نہ ہو کے مس کہیں ہو جائیں لخت، مٹی سے	62
37	لہو میں ٹیس کا اک سلسلہ اٹھاتا ہوا	63

38 روشن ہماری شام کہاں ہے چراغ سے 64
39 میں اپنے آپ سے واقف ذرا نہیں ہوتا 65
40 کش مسلسل لیجئے تو زندگی آسان ہے 66
41 نقوشِ حرفِ گزشتہ سبھی مٹا دوں گا 67
42 نگاہِ شوق میں ٹھہرا ہوا جنوں، میں تھا 68
43 کیا کہوں کتنی اذیت سے نکالی گئی شب 69
44 خوش نہ ہو عارضی بحالی پر 70
45 فکر میں ڈوبا ہوا جھیل سا گہرا اسلوب 71
46 ہوں کسی چشمِ رہنما کا ہدف 72
47 کاش یہ سوچتی پھرتی ہوئی افلاک پہ خاک 74
48 بے طلب انفس و آفاق میں رکھے ہوئے ہم 75
49 وحشتیں یوں ہی مری خاک میں رقصاں تو نہیں! 76
50 عجب اک راہ پر محوِ سفر ہوں 78
51 شراب ایسی ہی رکھی گئی پیالی میں 79
52 کستا ہی رہ نہ جائے کہیں تو کمان کو 80
53 کب جی سکے ہیں ٹھیک سے ہم اپنے حال میں 81
54 غموں کی جس کو ہر اک آن جستجو، مرا دل 83
55 دلا! جتن کوئی! اے میرے ناخدائے بدن 84
56 دل میں اب جذب کا عالم بھی چلا آئے گا 85
57 بس کہ اک لمس کی امید پہ وارے ہوئے ہیں 86
58 بادِ وحشت تھی کہ تھی بادِ فنا، یاد نہیں 87
59 محبت میں ہماری کاش اک ایسا بھی عالم ہو 88

60 وقت کچھ اور مرے ساتھ گذارو! یارو!! 89
61 کیا کہوں کتنا فزوں ہے تیرے دیوانے کا دکھ 90
62 زیست نے مجھ سے بایں طور نباہا! آہا!! 91
63 زمیں سرخی، زماں سرخی، مکیں سرخی، مکاں سرخی 92
64 کیف میں اپنے ہی رہتا ہوں میں سرشار بہت 94
65 قفسِ جاں سے تھی دشوار رہائی میری 95
66 ہم دیوانے اب کے سار انظم و نسق چلائیں تو!! 96
67 شوق سے خواہش تجدید بھی پالی جاتی! 98
68 روشنی مجھ میں بھر گیا کوئی 99
69 ہر گھڑی مجھ سے ہی کیوں ہے تو سوالی! زندگی!! 100
70 خود پر نئی حیات کے در وا کرے کوئی 101
71 رگ و ریشے میں مرے آن بسی ہو جیسے 102
72 ہمارے ہاتھ میں جب اس کا ہاتھ ٹھہرا ہے 103
73 قدم قدم رہِ الفت میں سرخوشی کے لئے 104
74 رائیگانی سے خواب کی، ڈر کے 105
75 مصائب ہی میں ممکن ہے تن آسانی نکل آئے 106
76 نظامِ شمس و قمر اک ذرا تکلف ہے 107
77 لبوں تک، تشنگی آنے سے پہلے 109
78 انھیں میں سمٹی ہوئی اپنی زندگانی ہے 110
79 جس گھڑی سے وہ شریک جسم و جاں بنتا گیا 112
80 ندی کے لب پہ کہاں یوں ہی تھرتھری ہوئی ہے 113
81 زندگی تیرے لئے بار نہ سمجھا جائے 115

82	خوشا کہ تیری وضاحت میں کام آتا ہوں	116
83	تعبیر کے دیوں سے نہ جب لاحقہ رہے	117
84	خیالِ یار کی زنجیر سے بندھا ہوا ہے	119
85	مجھ میں ہَوا تھی ایسی ہی رقصاں تمام عمر	120
86	یہ خاکی پیرہن اک اسم کی بندش میں رہتا ہے	121
87	وحشتیں جھوم اٹھیں ناچنے گانے لگ جائیں	122
88	پیاس ہر ذرّۂ صحرا کی بجھائی گئی ہے	123
89	جڑے ہوئے ہیں پری خانے میرے کاغذ سے	124
90	پھر پریم کی رچی نہ ہو کیوں آتم داہ میں	125
91	آنکھ کو نم نہیں کیا ہم نے	126
92	ہماری تشنگی کو آزمایا جا رہا ہے	127
93	ربط کچھ ایسا نہ تھا ان میں بھی خاص آپس میں	128
94	کشتِ احساس میں اس طرح ملا لیں گے تجھے	129
95	جب تک کہ وہ اک نقرئی منظر نہیں ہوتا	130
96	سرحدِ جاں میں جو اک عالمِ ہو ٹھہرا ہے	131
97	اک حال پر حیات نے رکھا کہاں مجھے	132
98	نفس نفس میں اذیت کی انتہا ہوئی ہے	133
99	وہ بھی کیا خوب اخوت کا جہاں ہوتا تھا	134

عرفان وحید
پارلیمنٹ ہاؤس، نئی دہلی

ارشد جمال صارمؔ: منفرد لہجے کا نادرہ کار شاعر

اچھے شعر کی خوبی یہ بتائی گئی ہے کہ اس کا سننے والا یہ محسوس کرے کہ گویا یہ اسی کے احساسات و تجربات کی ترجمانی ہے۔ لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لیے شاعر کو زندگی کا کتنا زہر پینا پڑتا ہے اس سے ایک سچا تخلیق کار ہی واقف ہو سکتا ہے۔ عام لوگوں کے احساسات کو اشعار میں پرونے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ذاتی رنج و آلام کے ساتھ ساتھ دوسروں کے دکھوں کو بھی بھوگا جائے۔ مشاہدے اور فکر کا یہی وصف ہے جو ارشد جمال صارمؔ کی غزل کو تپا کر کندن بناتا ہے۔

ارشد جمال صارمؔ کی آواز نئے زمانے کی سچی اور معتبر آواز ہے۔ وہ اپنے ذہن کے دریچے نئے تجربات اور نئی لفظیات کے لیے کھلے رکھتے ہیں۔ ان کے لہجے میں جو تازگی، فکر میں نادرہ کاری، تہ داری اور رمزیت ہے وہی ان کی انفرادیت کی علامت ہے۔ ان کی باریک بیں نظر جب ماضی کے جھروکے سے حال کے غرفے کی جانب پڑتی ہے اور جب وہ حال کے دریچے سے مستقبل کو ابہام کی شکل میں بیان کرتے ہیں تو ان کے شعر کا افسوں جان لیوا ہو جاتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں شعر سازی کا دشت زار کارگہِ شیشہ گری ٹھہرتا ہے۔

ارشد جمال نے تمام فنی قواعد و ضوابط کا خیال رکھا ہے۔ وہ فن کے رموز سے آگاہ ہیں۔ الفاظ و مفاہیم کے باہمی رشتے کو سمجھتے ہیں۔ ان کا ذخیرہ الفاظ لامحدود ہے، وہ الفاظ کو برتنے کے سلیقے، ان کی نشست و برخاست اور ان کی معنوی جہات سے بخوبی واقف ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل ایک ہفت رنگ کہکشاں بن گئی ہے۔ ان کے یہاں متخیلہ کی بے پناہ جست اور اسلوب و لہجے

کی سحر آگیں اثر انگیزی قاری کو دیر تک اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہے۔لیکن ان سب کے باوجود ان کی بے نہایت تخلیقی بصیرت اس شور و شر سے نا آشنا ہے جو آج کل کے شعـــرا میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ مجھے اطالوی فلسفی کروشے کے نظریہ فن کی یاد آرہی ہے جو کہتا ہے کہ ہر نغمہ پہلے اپنے مغنی کے بطن میں گایا جاتا ہے جہاں اس کی ہیئت اور حسن کی تکمیل ہوتی ہے۔جب مغنی اسے حرف وصوت میں تشکیل کر کے دوبارہ پیش کرتا ہے تو وہ اس نقش اول کا عکس اور موہوم خاکہ ہوتا ہے۔اس نظریے میں اندرونی جذبے اور مواد کو جو اہمیت دی گئی ہے وہ اس کے ابلاغ و اظہار کو حاصل نہیں۔صارمؔ کی دروں بینی اور خود کلامی بھی ہمیں ان کی بے نیازی کا پتہ دیتی ہے۔ہنگامہ آرائی کے اس دور میں ارشد جمـــال نے اپنے اس مجموعے کو انتہائی خاموشی سے ترتیب دیا ہے۔اپنے احساسات و وجدان کو تخلیق کا جامہ پہنانا ان کا اولین مقصد ہے۔ ہر چند کہ وہ سوشل میڈیا پر فعال ہیں اور بہت سے ادبی گروپس سے وابستہ بھی ہیں لیکن انھیں وہ تخلیق کے محرک کے طور پر لیتے ہیں، مقصد کے طور پر نہیں۔

ارشد جمال صارمؔ کی شاعری میں دھیمے اور ٹھہرے ہوئے لہجے کی نرمی بھی ہے اور اس کی زیریں لہروں میں تیز رو آبجو کی روانی بھی۔ہم واریؔ کلام ایسی کہ کوئی بھی غزل اٹھا لیجیے لہجے کے ٹھہراؤ، مضامین کے تنوع اور تخیل کی بلندی کی ایک سی کیفیت ملے گی۔ایسی پختگی کڑی ریاضت اور گہرے مطالعے اور مشاہدے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔صارم کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔طب و حکمت کے ساتھ ساتھ انھیں اردو شاعری کے کلاسک اور جدید سرمائے کا بھی گہـــرا شعور ہے اور وہ زبان و بیان سے بھی گہری واقفیت رکھتے ہیں۔صارمؔ الفاظ و تراکیب، تشبیہات و استعـــارات کے استعمال کے ڈھنگ سے آشنا ہیں اور نادر ترکیبیں وضع کر کے شعر میں ایک خواب ناک فضا پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔اس کے ساتھ گہری دینی بصیرت اور ستھـــرے ادبی ذوق نے ان کی شاعری میں ایک دلنواز گہرائی اور گیرائی پیدا کر دی ہے۔

صارمؔ کی شاعری سرگوشی اور خود کلامی کی شاعری ہے جس میں داخلی واردات کا بیان بھی ہے اور خارج کے حادثات سے بھی ان کی فکر وابستہ ہے۔ وہ غزل کے لوازمات سے بخوبی واقف ہیں اور عمدہ تخیل اور لفظی مناسبات سے شعر میں ایسا جادو جگاتے ہیں کہ سننے والا بہت دیر تک اس کے طلسم میں کھویا رہتا ہے۔ ایک اور خوبی جو صارمؔ کا امتیاز ہے وہ ہے شعر میں پیکر تراشی کا فنکارانہ استعمال۔ یہ اشعار دیکھیے:

جنوں کے پاؤں میں چھن کیسی در آئی کہ میں نے
ابھی وحشت کو صحرا میں اتارا ہی نہیں تھا

تمہاری یاد کے کاسہ بدست آتے ہی
کھنکنے لگتی ہے زخموں کی پوٹلی مجھ میں

ابھی بھی میز نے منظر سنبھال رکھا ہے
وہ میری چائے کی پیالی میں غم اترنے کا

اٹھے ندی کے لب سے کوئی موجِ درگزر
کب تک شجر جھکائے ہوئے سر کھڑا رہے

سر پٹکتی تھیں مسلسل موجہائے تشنگی
ہونٹ کے ساحل پہ خیمہ زن تھا پیمانے کا دکھ

صارمؔ کی تراکیب میں بھی بڑی ندرت پائی جاتی ہے۔ وہ شعر میں انوکھے مضامین، لفظی مناسبات اور نت نئی ترکیبوں کے استعمال سے ایک دل پذیر متحرک نظام (dynamic

system) تشکیل دیتے ہیں۔ بدن دریچہ، خواب کنیز، حرمِ چشم، کمکِ آتشیں، دہلیزِ خواب، جلوہ گہِ التباس، کفِ دوشیزہ دل، شفق رنگیٔ آفاق، وقت کے ہونٹ، دل کی زمین، جنوں کے پاؤں، شب کی مانگ جیسی نادرو نایاب ترکیبیں ان کے شعری جہان کا حصہ ہیں۔ واضح رہے کہ یہ تراکیب صرف دو یا تین غزلوں سے برآمد کی گئی ہیں، ورنہ ان کی غزل ایسی ہی نادرہ کاری سے مرصع و آراستہ ہے جس سے ان کی شاعری ایک طلسم خانۂ حیرت قرار پاتی ہے۔ ان کے ان اشعار کو اردو شاعری کے کسی بھی بہترین انتخاب میں رکھا جا سکتا ہے:

ڈور اک عشق کی جسموں سے بندھی ہے ورنہ
زیست کے پل سے گزرنا کوئی آساں تو نہیں

کون یہ شفاف، اجلی شال اوڑھے خامشی کی
مطمئن بیٹھا ہوا ہے شورِ محشر میں اکیلا

کبھی میں اپنی ہی تحویل میں نہیں ہوتا
یہ کائنات سمٹ آتی ہے کبھی مجھ میں

وہ دردخیز تھی اٹھی ہوئی نگاہِ طلب
میں خود کھنکنے لگا کاسۂ سوالی میں

یہ کیوں ابھی سے لہو تھوکنے لگا ہے قلم
ابھی تو صرف کہانی کی ابتدا ہوئی ہے

صارمؔ کے اشعار کا انتخاب کرتے وقت یہ فیصلہ کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے کہ کون سے شعر منتخب کیے جائیں اور کون سے چھوڑے جائیں۔ میں نے جتنے اشعار منتخب کیے ہیں ان سے کہیں زیادہ ایسے ہیں جو ان سے بہتر قدرو قیمت کے حامل ہیں مگر بوجوہ شامل مضمون نہیں ہو سکے۔ وجہ میری بے بضاعتی اور تنگ دامانی بھی ہے اور یہ مجبوری بھی کہ ان کے اس مخصوص شعری رویے کو اجاگر کرنا مقصود ہے جو ان کا شناخت نامہ ہے۔

ارشد جمال کے شعری اکتسابات کی ایک اہم جہت ان کا استعاراتی شعور ہے۔ ارسطو نے استعارے کو شعر کا امتیازی اور لازمی وصف قرار دیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ استعاروں ہی سے شعر میں نئی معنیاتی سطحیں وجود پذیر ہوتی ہیں اور کیف و تاثر میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ میں نے صارمؔ کے اس مجموعے کا متنی تجزیہ کرنے کے لیے اسے ایک کمپیوٹر پروگرام سے گزارا اور سب سے زیادہ وارد ہونے والے الفاظ کا تجزیہ کیا۔ ذرا نتیجہ ملاحظہ فرمائیں، یہاں چند الفاظ دیے جاتے ہیں:

خاک، بدن، ہستی، انسان، شب، چشم، خواب، نظر، زندگی، ذات، وجود، دنیا، زمین، سمندر، آسمان، عشق، غم، جنون، وحشت، محبت، شوق، دشت، صحرا، آئینہ، لہو، قدم، زخم، چراغ، در، ہاتھ، پھول، یاد، راہ، دریا، ذہن، حیات، سخن، فکر، چاند، منظر، خدا، روشنی، ہتھیلی، سرخی، خبر، اذیت، رقص، صبح، خوشبو، طلب، درد، ربط، لفظ، سحر، دھوپ، سورج، ستارہ، شام، موسم، کاغذ، احساس، زخم، پیشانی، رنگ، سفر، شجر، سوچ، ہونٹ، نمو، نور، صورت، دیوار، چاک، آگ، اشک، کہانی، روپ، شاخ، گلشن، گلاب، دھواں، ہنر، نقش، قید، حوصلہ، ارادہ، روشن، لباس، ساعت، وقت، رفاقت، آگہی، آرزو، امید، تشنگی، بام، حرف، آواز، شور، نصیب۔

یہ محض الفاظ نہیں ہیں بلکہ وہ استعارے ہیں جن سے ذات و کائنات کے بوقلموں داخلی اور خارجی احساسات و تجربات عبارت ہیں۔ یہ الفاظ ان کے اشعار میں استعارے اور پیکر میں ڈھل کر زندگی کے شعور و آگہی کی تجسیم کرتے ہیں۔ بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اب ٹھہرتی ہی نہیں مجھ پہ کوئی گردِ ملال
دل کے آئینے میں جس روز سے تو ٹھہرا ہے

آنکھیں حروف چومتی جائیں بصد نیاز
اور رحل دل پہ صفحہ وحشت کھلا رہے

روشن ہماری شام کہاں ہے چراغ سے
اک لَو اٹھی ہوئی ہے ہتھیلی کے داغ سے

کیا خبر کام کا لمحہ کوئی ہاتھ آجائے
کاسۂ وقت کسی روز کھنگالیں گے تجھے

مچل رہا ہے کسی رسمِ نارسائی کو
حصارِ چشم میں اک خواب کسمساتا ہوا

آسماں سوتا ہے شب بھر مرے سینے میں کہیں
چاند تارے مری آنکھوں میں جگا کرتے ہیں

اجالی جا رہی ہے پھر مرے اندر کی دنیا
مرے باہر چراغوں کو بجھایا جا رہا ہے

اٹھی نہ پھر وہاں سے کوئی نقرئی صدا
سب شور اس بدن کا خموشی میں مل گیا

فضا میں کھلتے ہیں آواز کے توانا پر
گلے سے باندھ رکھی ہے پرندگی اس نے

ہم عبث ہی کر رہے تھے عمر بھر سجدہ تجھے
لے تری چوکھٹ سے پیشانی اٹھا لی، زندگی!

سرِ صحرا جہاں تھم جاتے ہیں وحشت کے قدم
رقص کرتی ہے وہاں آبلہ پائی میری

ایسا اثبات بھی تشکیل ہوا ہے مجھ میں
بھر دیا جس نے مری ذات میں انکار بہت

وہ آیتیں ہیں کہ لرزیدہ ہے جہانِ وجود
ہم اس صحیفے سے اے کاش! بے خبر رہتے

صارمؔ کی پوری شاعری ان کے تجربے اور اندرون کا بیش قیمتی اظہار ہے۔ ایک ایسی شاعری جو لسانی کرافٹ اور معنوی جہت ہر دو سطح پر اپنا اعتبار قائم کرتی ہے۔ ہم عصر شاعری میں فنی درو بست کا اس قدر اہتمام ناپید نہیں تو خال خال ضرور ہے۔ چونکہ کسی شاعر کا بہترین اور اصل تعارف اس کا کلام ہوتا ہے۔ تو آئیے ارشد جمال صارمؔ کی غزل سے ملاقات کیجیے اور ان کے اس شہرِ جمال کے حسینوں کو دیکھ کر سر دھنیے۔

ڈاکٹر افتخار الحق

ماہر تعلیم، لاہور، پاکستان

سخن زاد کا تخلیقی وجدان

''شاعری جُزوِ پیغمبری است'' کی بنیاد پر ہی مثنوی مولانا روم کو ''ہست قرآں درزبانِ پہلوی'' کہا گیا ہے۔ لفظ شاعری اور شعر کا مآخذی تعلق ہر لحاظ سے شعور سے بنتا ہے لیکن شعر ہمیشہ الہام کی کوکھ سے نکل کر شعور کی گود میں پلتا ہوا صفحۂ قرطاس پر ایک کڑیل جوان کی صورت نمودار ہوتا ہے۔ مشرقی شاعری، خصوصاً اردو سخنوری کا حسن ایک طرف اس کے مخصوص اوزانِ پیمائش میں تو دوسری طرف اس کی روایت کی جڑوں کا کئی ثقافتوں میں پیوست ہونا بھی ہے۔ عربی، فارسی، ہندی اساطیر سے لے کر یونانی و مصری دیو مالائی تہذیبی عناصر نے اردو شاعری کے دامن کو نہ صرف بھرے رکھا بلکہ اس کو وسعت بھی عطا کی۔ اپنے ارتقائی سفر میں اردو شاعری دو قد آور اصناف کے ساتھ اکیسویں صدی کے منظر نامے پر چھاتی چلی گئی یعنی غزل اور نظم۔ اب اگر ان دو اصنافِ سخن اردو کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ''یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا'' کی سی بات ہوگی کہ اس موضوع پر تو مقالے درکار ہوں گے، مضمون یا تقریظ اس موضوع کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ میں ذاتی طور پر حامیان و پرستارانِ غزل کے قبیل سے تعلق رکھتا ہوں اور اسی لیے مجھے غزل گو شعراء سے خاص لگاؤ ہے۔ غزل میں شہکار اشعار اور غزل کے معترضین میں اگر ایک محتاط تناسب قائم کیا جائے تو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ایک اور ایک ہزار کی نسبت ملے گی، یعنی اگر ایک ناقد غزل کا مخالف ہے تو اس کے سامنے غزل کے دفاع میں ایک ہزار ایسے زبردست اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں کہ ''مُشک آنست کہ خود ببُوید'' کا سماں ہو جائے گا۔ اس کی وجہ اور ثبوت ہر دور میں فیضؔ،

جگرؔ، فرازؔ، ناصرؔ کاظمی، عرفانؔ صدیقی، احمد مشتاق، سعودؔ عثمانی، شہزاد نیرؔ، عباس تابشؔ، شاہینؔ عباس، اخترؔ عثمان، سالم سلیمؔ، امیرؔ امام، ابھیشیک شکلا اور ارشد جمال صارمؔ جیسے غزل گو شعرا کی موجودگی ہے جنھیں اللہ نے غزل گوئی کا قابل رشک ملکہ عطا کیا ہے۔

ارشد جمال صارمؔ کو بلا مبالغہ عصری شاعری کا ایک نمایاں نام کہا جا سکتا ہے اور ایسا کہنے کی کئی ٹھوس وجوہات ہیں۔ صارمؔ کا کلام لگ بھگ پانچ سال سے مختلف حوالوں سے زیر مطالعہ رہا ہے اور میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ انکے اشعار میں کوئی نہ کوئی چونکا دینے، سنجیدہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور ناقدین سخن کو ذرا سیدھا ہو کر بیٹھنے والی بات ضرور ملتی ہے۔ صاحبان! اردو غزل لکھنا بیک وقت آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ سوائے غزلِ مسلسل کے عمومی غزل میں وحدتِ موضوع کی پابندی نہیں ہوتی لیکن اسی پابندی کا نہ ہونا یوں دشواری پیدا کرتا ہے کہ ہر شعر میں بطور اکائی ایک پورے موضوع کو سمیٹنا ہوتا ہے۔ اب یہ کام کوئی بھی مبتدی یا اوسط شاعر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن ایک منجھا ہوا شاعر ایک شعر میں معانی و مضمون کی کائنات کو جب سموتا ہے تو ایسے شعر از خود وارد ہونے لگتے ہیں:

کبھی میں اپنی ہی تحویل میں نہیں ہوتا
یہ کائنات سمٹ آتی ہے کبھی مجھ میں

کفِ ملال پہ رکھے ہوئے چراغ ہیں ہم
کہاں بہ چشمِ طرب زاد معتبر رہتے

بس تجھے دھند کی اک تہہ سے گزرنا ہوگا
ہم ترے روپ کو آئینہ بنا سکتے ہیں

اٹھی نہ پھر وہاں سے کوئی نقرئی صدا
سب شور اس بدن کا خموشی میں مل گیا

آفاقیت اور معنوی گہرائی سے لبریز یہ اشعار کسی بھی باذوق قاری کو جھومنے پر مجبور کر سکتے ہیں اور اردو غزل کی محدودیت کا اعتراض اٹھانے والے نقادوں کو اپنی رائے پر نظر ثانی کیلیے قائل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔

شعروں کی آمد اور آورد کی کلیشیائی زدہ بحث کا صدی خوردہ تنازعہ ایسے شعروں کو دیکھ کر بآسانی حل کیا جاسکتا ہے جن میں نہ صرف منفرد بحر کا انتخاب کیا گیا ہو بلکہ اس بحر میں سنگلاخ اور مشکل زمین میں کامیاب شعر کے تناور درخت اگائے گئے ہوں۔اس کی کچھ مثالیں یہ ہیں جنھیں پہلے تو پڑھتے ہوئے روایتی بحر و زمین سے دل و دماغ کے خلیاتِ ذوق کو مانوسی کا احساس قدرے دقت سے ہو اور پھر اگلے مرحلے میں ایسے شجر کی معنوی بلندی کا اندازہ لگانے میں بھی اچھا خاصا وقت لگ جائے:

اٹھا لے وقت کی تھالی سے لمحۂ بے سود
پھر اس میں اشک ملا اور ستارہ کر کے لا

تمام رنگ ہیں وحشت کے مجھ میں ہونے سے
دھواں نہ ہو جو نظر میں،تو پھر نظارہ نہیں

اپنی وسعت کے مطابق ہی عطا ہے اس کی
اس نے کب ہم پہ ضرورت سے زیادہ باندھا

وہ اک لمحہ سزا کاٹی گئی تھی جس کی خاطر
وہ لمحہ تو ابھی ہم نے گزارا ہی نہیں تھا

جانے کیا تعبیر لے آئے گا اب کے خواب میرا
میں غزل کہتا ہوں بیٹھا صحنِ کوثر میں اکیلا!

آخری شعر پڑھ کر تو خواجہ حسن نظامی کا ''کوثر و تسنیم میں دھلی اردو'' کی بابت بیان کی تائید ہوتی ہے اور پھر شعر کے موضوع کے پاکیزہ ماحول سے شاعر کا فکری آلودگی سے پاک ہونے کا احساس تقویت پکڑتا ہے کہ ایسا شعر روحانی بالیدگی کے صدقے ہی عطا ہوتا ہے۔ اس بحر اور زمین سے کتنا عجیب ترنم و آہنگ دل کے پردوں پر ابھرتا ہے، اسے موسیقی کی زبان ہی بتا سکتی ہے۔

اردو غزل پر لگنے والے بڑے الزامات میں ایک یہ ہے کہ اس کے دامن میں موضوعات کی کمی ہے۔ جن چنیدہ موضوعات و مضامین پر بیشتر شعر لکھے جاتے ہیں، ان میں آئینہ و عکس، خواب و تعبیر، چاک اور کوزہ، زخم اور مرہم شامل ہیں۔ اس اعتراض کا سب سے بڑا جواب تو یہ ہے کہ انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کے ناتے اس کے خالق نے یہ خاصیت دی ہے کہ وہ ایک ہی بات کو بلا مبالغہ متعدد زاویوں سے دیکھ بھی سکتا ہے اور اس کا اظہار بھی تقریباً بیشمار طریقوں سے کر سکتا ہے ''اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں'' میر انیس جیسے استاد کی اس سند سے بڑھ کر شاید ہی کوئی دلیل یا شعر اس ضمن میں پیش کیا جا سکے۔ اب دبستانِ صارمؔ میں اس کی مثال دیکھتے ہیں کہ آئینے اور عکس کی تلازمہ کاری کا رنگ ان کے ہاں کیا ہے:

مستقل رہتا ہے مجھ پر مُنعکس اک آئینہ
دیکھتی رہتی ہے پیہم ایک حیرانی مجھے

اسی غزل کے دو اشعار میں حسنِ تضاد نے مجھے بار ہا اپنے طلسم میں جکڑا اور بار بار سوچا کہ کاش سہل ممتنع کی تفصیل گل کے لیے کوئی اصطلاح/ترکیب مجھے میسر ہوتی تو اس کا سہارا لیتا:

ختم ہو جاتا ہے یکدم عالم ناممکنات
گھیر لیتی ہے یکا یک موجِ امکانی مجھے

کیا کہوں دشوار کتنی ہیں مجھے آسانیاں
کیا کہوں کیسی سہولت ہے پریشانی مجھے

سوائے "ہائے ہائے" کے کچھ اور دل سے نہیں نکلتا کہ داد دینا بھی ایک فن ہے اور ایسے لاجواب شعروں کی داد دینے والا لفظوں کو تولتا ہی رہ جاتا ہے۔

اکثر شعرا کے کلام پر تبصرے کے وقت شاعر کے عمومی مزاج کو بھی زیرِ مطالعہ رکھا جاتا ہے کہ آیا شاعر رجائیت کا قائل ہے یا قنوطیت کی طرف مائل۔ گو کسی حد تک ایسی حتمیت جواز رکھتی ہے، لیکن یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ کوئی بھی شاعر دنیاوی مسائل و آلام پر ردِ عمل جس انداز میں بھی کرے اس کی بنیاد پر قطعیت کے ساتھ رائے کی عمارت کا ستون کھڑا کرنا شاید مناسب نہ ہو کہ دل کی دنیا کے اپنے رنگ ہوتے ہیں، لفظوں کی اپنی خوشبو اور ترسیل و ابلاغ کی اپنی زبان۔ صارمؔ کے کئی اشعار میں رجائیت کی فضا بہت دلکش ہے، جیسا کہ ان شعروں میں محسوس کیا جا سکتا ہے:

شاخِ گریہ پہ رکھیں آؤ تبسم کے گلاب!
درد کا کیا ہے؟ جہاں والے دیا کرتے ہیں

اس شعر میں رجائیت بے نیازی کی سرحدوں پر اعتماد سے کھڑی نظر آتی ہے۔

ستارہ بن کے چمکتا رہوں گا صدیوں تک
فلک گواہ رہے گا مرے ابھرنے کا!

واہ! کیا امید ہے اور کیا لہجہ ہے۔ وہی انسان کی ابدیت کو پالینے کی خواہش کا اظہار جسے کبھی شاعرانہ تعلّی بھی کہا جاتا ہے۔ "کل اور کسی نام سے آجائیں گے ہم لوگ" کی سی کیفیت ہے جو شاعرانہ جذب و مستی سے ہی نصیب ہوتی ہے۔

ارشد جمال صارمؔ نے اپنے نام کا بیّن ثبوت بھی جا بجا دیا ہے۔ ان کے کلام میں جمالیات کا اپنا انداز ہے جو انھیں سے مخصوص ہے اور جس پر کہیں بھی توارد یا پرانی بات دہرانے کا شائبہ تک نہیں ہوتا:

بس اتنا ربط کافی ہے مجھے اے بھولنے والے
تری سوئی ہوئی آنکھوں میں اکثر جاگتا ہوں میں

کھلے ہوئے ہیں کئی زخم شاخ لب پہ ہنوز
میں چوم آیا تھا اک پھول بے خیالی میں

اس نے جو روشنائی بھری چشمِ شوق میں
میں نے بھی اپنے آپ کو قرطاس کر لیا

ان شعروں میں موجود ارشد کا رنگِ جمال کس قدر انوکھا، جداگانہ اور جاذبِ نظر ہے، اس کا اندازہ بار بار کی قرأت کے بغیر ناممکن ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ ارشد جمال صارمؔ جدید شاعری، بالخصوص غزل کے لامتناہی افق پر بہت دیر تک جگمگائیں گے۔

ڈاکٹر ارشد جمال صارمؔ

مالیگاؤں، مہاراشٹر

مگر وہ غم کہ جو کرتا ہے شاعری مجھ میں

غالباً یہ طبیعت میں موجود فطری موزونیت کا اثر تھا کہ مجھے زمانۂ طالب علمی کے ثانوی ایام سے ہی اشعار بڑی آسانی سے ازبر ہو جایا کرتے تھے۔ بیت بازی مقابلوں میں شمولیت نے اس ذوق کو مزید جلا بخشی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہونچنے کے بعد تو جیسے یہ شوق اپنے عروج کو پہونچ گیا اور حروف، الفاظ اور موضوعات پر اشعار کا ایک خزانہ میری زنبیل کا حصہ بن گیا۔ پھر پروگرام کی نظامت میں استعمال ہونے والے، استقبالیہ اور الوداعی تقاریب میں کام آنے والے، طلباء کے ٹائٹلس کے ساتھ چسپاں کیئے جانے والے اور اسی طرح کے بے شمار مواقع پر کارآمد شعروں کی ذخیرہ اندوزی کا ایک نیا سلسلہ بھی چل پڑا۔ اشعار کے جمع وانتخاب کا یہ سلسلہ کب شعر گری کے ہنر سے متصف ہو گیا اس کا احساس اس وقت ہوا جب مسلم یونیورسٹی کا تعلیمی مرحلہ اپنے اختتام کے قریب پہونچ گیا۔ آپ اسے ضرور میرے مزاجی تکلف یا شرمیلے پن سے تعبیر کریں گے کہ شعبۂ اردو کے معتبر اساتذہ تک رسائی ہونے کے باوجود بھی کبھی کسی کی شاگردی اختیار کرنے کی جرآت نہیں کر سکا اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسین، بنگلور میں ایم۔ ڈی میں داخلے کے بعد تو کسی کے یہاں زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا خیال بھر ہی رہ گیا۔ بھلا ہو سوشل میڈیا کا کہ اس کی وساطت سے چند ایسے احباب میسر آئے جنھیں میں شاعری کے حوالے سے بجا طور اپنے شعور کا استاد کہہ سکتا ہوں۔ ان میں جناب سرور عالم راز سرورؔ، رحمان حفیظ، جاوید عادل سوہاوی، محمد خاورؔ، خورشید طلبؔ اور احمد کمالؔ

حشمی صاحب قابل ذکر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھ کم بساط کی ذہن سازی میں ''اردو انجمن'' اور ''انحراف'' کی تنقیدی نشستوں کا بڑا حصہ ہے۔

شاعری میرے لئے بھی ذات کے توسط سے کائنات میں موجود استعاروں کی دریافت کا نام ہے جو شعوری اور غیر شعوری محرکات کے زیر اثر لمحات کے کرب سے نمو پذیر ہوتی ہے اور لب اظہار کی زینت بنتی ہے۔ فکر و نظر کے دھاگے میں حروف گوندھنے کا عمل میرے یہاں ہمیشہ ہی ذات کے نہاں خانے سے گزر کر تسبیح کے مرحلے کو پہونچتا ہے۔ آپ بجا طور پر میری شاعری کو ضمیر متکلم کی شاعری کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ میں خارج کو داخل سے الگ کر کے دیکھنے کا قائل ہی نہیں بلکہ یہ کہیں کہ متخیلہ دمِ تخلیق میرے باطن میں ہی خارج کے انتشار کو لا سمیٹتی ہے اور پھر میں اس خرابے میں خیمۂ گرد نصب کر کے دم بہ دم منقلب ہوتے ہوئے منظروں سے سمعی، بصری اور حسی پیکر تراشتا رہتا ہوں۔

لفظوں کی معیت میں ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد بھی مجھ میں یہ احساس جا گزیں ہے کہ شاید میں اس شعری رویے کو حاصل کر پانے میں ناکام ہوں جو میرا منتہا و مقصود ہے اور جسے میں اپنی شناخت کرنا چاہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیق کی سرشاری مجھے آمادۂ رقص تو کرتی ہے لیکن جلد ہی میں اپنے پاؤں کی جانب دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مجموعہ کلام کی اشاعت میں تاخیر کا ایک بڑا سبب یہی بے اطمینانی ہے جو مجھے اب بھی شرح صدر کے ساتھ اس کی طباعت کی اجازت نہیں دے رہی ہے لیکن میں اپنے خیر خواہوں کی ضد اور دوستوں کے مسلسل اصرار کے آگے زیر ہوں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں اپنے پہلے شعری مجموعے کو منظر عام پر لا کر بہت سارے احباب کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کا اہل ہوا ہوں۔

اس مجموعے کی اشاعت کو حتمی بنانے میں میرے جن رفقاء کی محبت اور خلوص نے کلیدی رول ادا کیا ہے میں ان کا بے انتہا ممنون و متشکر ہوں۔ سالم سلیمؔ، جہانگیر نایابؔ، ذیشان الٰہیؔ، احمد

مشرف اور ابو ضیغم خان نے نہ صرف یہ کہ "سخن زاد" کی ترتیب کی تحریک دی بلکہ غزلوں کے انتخاب کے مشکل مرحلے میں ابھی اہم کردار ادا کیا۔ برادرم عرفانؔ وحید، ڈاکٹر افتخار الحق، ڈاکٹر خالد مبشر اور جناب سلیمؔ انصاری صاحب نے اپنی تحریروں سے مجموعے کے وقار میں اضافہ کیا، میں ان تمام احباب کا بہ صمیم قلب سپاس گزار ہوں۔ آخر میں میں ڈاکٹر عبد القوی، ڈاکٹر احمد ندیم، ڈاکٹر انعام اللہ فلاحی، ڈاکٹر وسیم احمد، ڈاکٹر محمد ساجد، ڈاکٹر شمیم ارشاد، ڈاکٹر شبیر احمد پرے، ڈاکٹر جاوید احمد خان، ڈاکٹر محمد شاکر، ڈاکٹر محمد اسلم، ڈاکٹر شیبہ فیروز اعظمی، عاصم اکرم اور دیگر بے شمار دوستوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ ان کی مخلصانہ محبتوں نے مجھے غیر معمولی حوصلہ اور پیار دیا۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے والدین، اہلیہ اور بچوں کا شکریہ نہ ادا کروں کہ میری ساری کوششیں ان کی دعاؤں سے ہی رسد حاصل کرتی ہیں۔
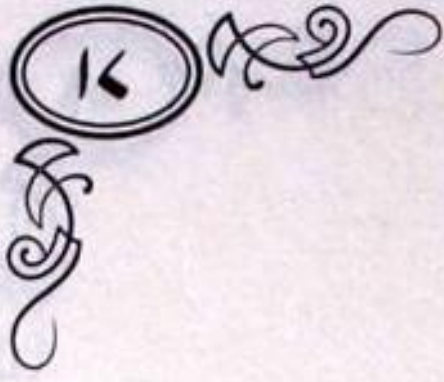
مجھے آئینۂ فکر و نظر دے
مرے سینے میں اپنا نور بھر دے

وگرنہ کیا مری حرف آشنائی
ہنر مجھ کو اگر دے، معتبر دے

مسافت کی تھکن پاؤں میں اترے
بہت دن ہو چکے، اذنِ سفر دے

جو سینہ چاک کر دے آسماں کا
نواؤں میں مری ایسا اثر دے

یوں محرومِ خودی کب تک رہوں میں
خدایا میرے ان کاندھوں کو سر دے

میں اک خاکِ معانی ہوں مجھے بھی
حروف ولفظ کی مٹھی میں بھر دے

جلا دینے کے درپے ہے یہ آتش
عذابِ آگہی سے اب مفر دے

نہ تیرے ماسوا کچھ دیکھ پائیں
مری آنکھوں پہ ایسا سحر کر دے

مجھے یہ خیمۂ ابر کرم ہیں
سلگتے خواب ان آنکھوں میں بھر دے

مکین یوں تو سخن زاد ہیں کئی مجھ میں
مگر وہ غم کہ جو کرتا ہے شاعری مجھ میں

کبھی میں اپنی ہی تحویل میں نہیں ہوتا
یہ کائنات سمٹ آتی ہے کبھی مجھ میں

کسی کے عشق کا روشن الاؤ ہے ورنہ
ٹھٹھر گئی تھی کوئی شام زندگی مجھ میں

تمہاری یاد کے کاسہ بدست آتے ہی
کھنکنے لگتی ہے زخموں کی پوٹلی مجھ میں

نہ جانے کون سی چوپال ہے اسے مطلوب
وہ داستان جو رکھی ہے ان کہی مجھ میں

میں اضطرار کا منت گزار ہوں پیہم
کبھی تو پھوٹے گی آخر کوئی نمی مجھ میں

ہتھوڑے مارتی رہتی ہے دم بہ دم صارمؔ
ٹنگی ہوئی ہے جو سانسوں کی یہ گھڑی مجھ میں

شام کے سرمئی آنچل سے ہویدا ہوگا
میرے آئینے میں اک عکس جو رکھا ہوگا

آگ بھی ہوگی اسی جسم کی مٹی میں مکیں
پیرہن برف کا جس جسم سے لپٹا ہوگا

اس کا آشوب مری ذات سے وابستہ تھا
اس خرابے میں مرے بعد ہوا کیا ہوگا
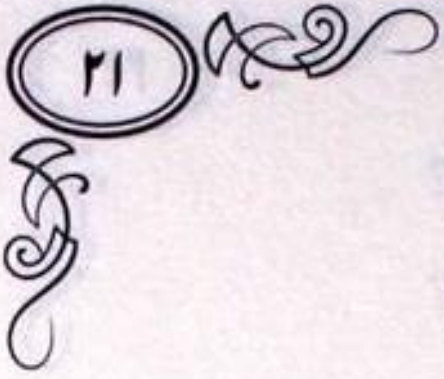
چومتے ہوں گے عقیدت سے کبھی ہونٹ اسے
اور وہ اپنی تلاوت کو ترستا ہوگا

دید کی آس میں اٹکی ہوئی دو آنکھوں کا
آج بھی بوجھ اٹھائے وہ دریچہ ہوگا

اک ندی اب بھی پہاڑوں سے گزرتی ہوگی
اک دیا اب بھی فروزاں سرِ صحرا ہوگا

ماند ہوں گے کسی عارض پہ مسرت کے نقوش
بوسۂ غم کسی پیشانی پہ سجتا ہوگا

ہم پہ مرقوم بھی ہوں گی کبھی آیاتِ اماں؟
ہم پہ اب درِ بھی اخوت کا کبھی وا ہوگا؟

اک سفینہ نور کا تاریک منظر میں اکیلا
تیرتا ہے رات کے گہرے سمندر میں اکیلا

کون یہ شفاف، اُجلی شال اوڑھے خامُشی کی
مطمئن بیٹھا ہُوا ہے شورِ محشر میں اکیلا

جھلملاتے ہیں اب اِس میں روپ دنیاوی غموں کے
پہلے تُو ہی تُو نظر آتا تھا ساغر میں اکیلا

دیکھتے ہی گھیر لیتی ہیں مجھے غم زادیاں کیوں؟
ایک مَیں ہی خاک زادہ ہوں جہاں بھر میں اکیلا؟

جائزہ لیتا ہے شب بھر اپنی تن آسانیوں کا
دَم بہ دَم پہلو بدلتا جسم بستر میں اکیلا

پھوٹتی ہے بس تمہاری روشنی دل کے کلس سے
ایستادہ ہے تمہارا بت ہی مندر میں اکیلا

دور تک روباہیوں کا سلسلہ ہے اور میں ہوں
سادگی و مہر کا سودا لئے سر میں اکیلا

جانے کیا تعبیر لے آئے گا اب کے خواب میرا
میں غزل کہتا ہوں بیٹھا صحنِ کوثر میں اکیلا

ناگاہ نوچ کر ہی نہ رکھ دیں کہیں مجھے
ناخن جو یہ نصیب ہیں اپنے تئیں مجھے

کس نے یہ لا کے جلوہ گہِ التباس سے
پیشانیٔ یقیں پہ کیا ہے نگیں مجھے

تا ان سے کسب کر لوں معانی کے رس تمام
جانا ہے حرف و لفظ کے اتنے قریں مجھے

میں آسماں کی سمت بڑھا جا رہا تھا اور
حسرت سے تک رہی تھی مسلسل زمیں مجھے

رکھتا ہوں یوں بھی آنکھ میں کشتہ جنون کا
دہلیزِ خواب پر نہیں رکھنی جبیں مجھے

میں ان کے التفات سے نا آشنا رہا
آنکھیں کسی دریچے سے تکتی رہیں مجھے

پھر آ گھرا ہوں سرد رویّوں کی بھیڑ میں
آ جائے پھر کوئی کمکِ آتشیں مجھے

کارِ سخن ہے گویا کوئی زہرِ آگہی
رکھتی ہے سبز فکر مری نیلمیں مجھے

خود آگہی سے اسے آشکارا کر کے لا!
یہ اپنی ذات لے، اس کو ادارہ کر کے لا!

اتار پھینک نظر سے لباس ریشم کا
دل و دماغ کو اپنے کنوارا کر کے لا!

اٹھا لے وقت کی تھالی سے لمحۂ بے سود
پھر اس میں اشک ملا اور ستارہ کر کے لا!

وہی جواب! ہو تمرین عشق میں ناکام
وہی طلب کہ اسے جا دوبارہ کر کے لا!

تمام جسم کلیشے کا استعارہ ہے
تو اپنے آپ کو تازہ شمارہ کر کے لا!

اب اور ہوتا نہیں ہم سے کارِ دربدری
ہمیں ہمارے بدن میں ہمارا کر کے لا!

مکانِ خواب میں رکھ اور وحشتیں صارم
بفیضِ گریہ یہ آنکھیں نظارہ کر کے لا!

دنیا کو آسمان کی تھالی میں مل گیا
آنسو جو خاکِ گریہ و زاری میں مل گیا

اک پھول اور جھڑ گیا حاجت کی شاخ سے
اک عطر اور جسم کی مٹی میں مل گیا

رقصاں بہ فرطِ جوش ہوئی ناقۂ خیال
سکّہ ہی ایسا ذہن کی جھولی میں مل گیا

اک ہوک ماہتاب کے سینے سے کیا اٹھی
صد اضطراب جھیل کے پانی میں مل گیا

ہونا تھا جس کو صبح کی اجلی پناہ میں
وہ جا کے شب نژادوں کی ٹولی میں مل گیا

اک نم کہ مل سکا نہ جو دریا کی آنکھ میں
صحرا کی خشک سال ہتھیلی میں مل گیا

خاکستری اترنے لگی برگ و بار پر
وہ زہراب کے بادِ بہاری میں مل گیا

اٹھی نہ پھر وہاں سے کوئی نقرئی صدا
سب شور اس بدن کا خموشی میں مل گیا

فکر کی پہنائیوں میں اڑ رہا ہوں چار سو
ذہن کی ٹیبل پہ رکھے لفظ کے جام و سبو

کب تلک یوں ہی بندھا رکھیں صحیفہ جسم کا
آؤ اب بہرِ تلاوت کرلیا جائے وضو

زیست کے تالاب میں کنکر طلب کرتی ہوئی
دائرہ در دائرہ وہ پھیلنے کی آرزو

ہوگئی ہیں شہر میں آباد ساری وحشتیں
جا بجا ہے دشت کی ویرانیوں میں ہاؤ ہو

پھر اسی لاحاصلی کا ہو شرف حاصل مجھے
پھر مرے حصے میں رکھی جائے کشت بے نمو

دن بہ دن بے چہرگی کا ہو رہا ہوں میں اسیر
دن بہ دن بڑھتی ہے مجھ میں آئینوں کی جستجو

آس کا اک آخری طائر تھا، وہ بھی اڑ گیا
آسماں پر ہے ابھی لکھا ہوا، لاتقنطوا

کہیں بھی وسعتِ افلاک میں نہیں ملتا
خدا اگر دلِ صد چاک میں نہیں ملتا

گمانِ سبز ہے جس دم سے موجزن مجھ میں
میں اپنے حیطۂ ادراک میں نہیں ملتا

یہ دل پرندہ تبھی تک ہے شاخ پر محفوظ
کہ جب تلک ترے فتراک میں نہیں ملتا

گلاب صورتیں اگتی نہیں زمینوں سے
ہمارا خون بھی اب خاک میں نہیں ملتا

برہنگی ہے مسلط یوں اپنے ذہنوں پر
خیال کوئی بھی پوشاک میں نہیں ملتا

امیدیں ایسی بجھی ہیں کہ اب خوشی کا اثر
کسی بھی جشنِ طربناک میں نہیں ملتا

تمام عمر حصارِ گل و گہر رہتے
بس ایک بار جو ہم تیرا مستقر رہتے

جنہیں تلاش تھی آئینہ ہائے وحشت کی
وہ میری ذات کے زندان میں اتر رہتے

وہ آیتیں ہیں کہ لرزیدہ ہے جہانِ وجود
ہم اس صحیفے سے اے کاش! بے خبر رہتے

بلا سے خاک ہی ہوتے تمہارے کوچے کی
بجھے بھی رہتے تو پابستۂ شرر رہتے

کفِ ملال پہ رکھے ہوئے چراغ تھے ہم
کہاں بہ چشم طرب زاد معتبر رہتے

فشارِ آتش سوزاں تھا منکشف ہم پر
ہم اس گلاب کی تحویل میں اگر رہتے

یہ کون لوگ ہیں حیوانیت پہ آمادہ
یہ کیوں ہیں شامل غارت گری، بشر رہتے

شعار کر کے چراغوں کی پیروی اس نے
نبھائے رکھی ہے رسمِ پیمبری اس نے

فضا میں کھلتے ہیں آواز کے توانا پَر
گلے سے باندھ رکھی ہے پرندگی اس نے

کچھ اس ادا سے نچھاور ہوئی شبِ ہجراں
بدن سے چادرِ وصلت اتار دی اس نے

میں راہِ راست پہ مشکل سے آنے والا ہوں
مری سرشت میں رکھی ہے خودسری اس نے

تھی اس کی ذات سے مطلوب چھاؤں دنیا کو
سو تپتی دھوپ سے اپنالی دوستی اس نے

یہ کیا کہ دے کے سمندر کی سلطنت مجھ کو
مرے لبوں سے اٹھالی ہے تشنگی اس نے

کہاں کہاں سے سناؤں تمہیں فسانۂ شب
طویل گزرا ہے مجھ پر بہت زمانۂ شب

مہک رہا ہے ہمیں سے حریمِ گلشن روز
ہمیں سے نور فزا ہے نگار خانۂ شب

خموش ہوتے ہیں دن کے تمام تر سکّے
کھنکتا رہتا ہے کشکولِ دل میں آنۂ شب

ہر ایک شاخ پہ ویرانیاں مسلط ہیں
بدن درخت بھی گویا ہے آشیانۂ شب

تمام یادیں تو آ بیٹھتی ہیں شام ڈھلے
اداس رہتا ہے پھر کس لئے سرہانۂ شب

امید خاک رکھی جائے اب اجالوں کی
چراغ اوندھے پڑے ہیں بہ آستانۂ شب

کوئی چراغ نہیں، گل نہیں، ستارہ نہیں
سوادِ جاں پہ کہیں زیست آشکارہ نہیں

سراب آگیں ثقافت کی درسگاہیں ہیں
وہ آنکھیں سبز روایات کا ادارہ نہیں

تو کیا! میں اہل نہیں دشت کی ریاضت کا
تو کیا! جنوں کا کوئی مجھ میں استعارہ نہیں

تو! جن پہ جھول رہا ہے ہوس کی بانہیں ہیں!
وفا کی ڈور، محبت کا گوشوارہ نہیں!!

تمہیں خبر تو ہے! جل اٹھتی ہے قبائے وجود
نہیں! وہ خواب مری آنکھیں! اب دوبارہ نہیں!!

میں اپنی مرضی سے یک لحظہ بھی گزار سکوں
حیات! اتنا بھی تجھ پر مرا اجارہ نہیں؟

تمام رنگ ہیں وحشت کے مجھ میں ہونے سے
دھواں نہ ہو جو نظر میں، تو پھر نظارہ نہیں!!

زندگی! تجھ سے کیا عہد نبھا سکتے ہیں
بوجھ ہم اور بھی زخموں کا اٹھا سکتے ہیں

اپنی پہنائی کو افلاک کی وسعت کم ہے
اوک میں اپنی سمندر بھی سما سکتے ہیں

اب تو خود بینی سے رشتہ بھی نہیں ہے اپنا
اب محبت تری تحویل میں آسکتے ہیں؟

بس تجھے دھند کی اک تہہ سے گزرنا ہوگا
ہم ترے روپ کو آئینہ بنا سکتے ہیں

بچ کے رہنا کہ یہ خوابیدہ نگاہوں والے
خیمۂ شب سے تری نیند اڑا سکتے ہیں

یہ جو اوڑھے ہوئے پھرتے ہیں ردائے اوہام
گل ایقان سرِ دشت کھلا سکتے ہیں

ناز و انداز ترے ایسے ہی از بر ہیں کہ ہم
تیری آواز کی تصویر بنا سکتے ہیں

آج بھی جاگی ہے آنکھوں میں اذیت کی طلب
آج بھی آپ مرے خواب میں آسکتے ہیں
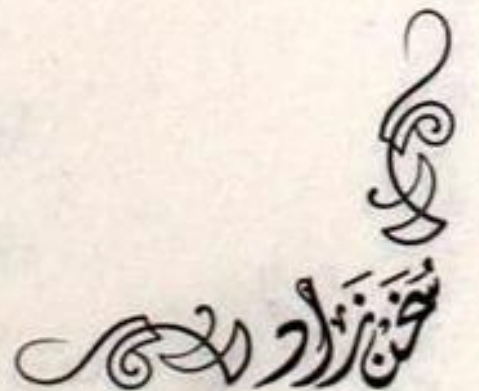
اتنا قرینِ دامنِ احساس کرلیا
تجھ کو شریکِ چشمۂ انفاس کرلیا

مجھ پر نثار پھرتی ہیں دریا کی ثروتیں
جب سے لبِ جنوں پہ تجھے پیاس کرلیا

میں نے جو روشنائی بھری چشمِ شوق میں
اس نے بھی اپنے آپ کو قرطاس کرلیا

اچھا ہوا کہ ہم نے بچھڑنے سے قبل ہی
طاری سوادِ روح پہ بن باس کرلیا

میں یوں ہی اس کے ہاتھ کا پارس بنا رہا
اور اس نے خود کو گوہر و الماس کرلیا

وہ فکر جس پہ حرف کی دیوی ہو مہرباں
وہ ذہن جس نے لفظ کا آبھاس کرلیا

ارادہ ہو جو ترا شب کی مانگ بھرنے کا
کر اہتمام مری خاک سے گزرنے کا

تمہارا ذکر، تمہاری طلب، تمہارا خیال
علاوہ اس کے نہیں کام کوئی کرنے کا!!

میں اپنی آنکھیں تو رکھ لوں بدن دریچوں پر
اِبھی اسے! شوقِ نظارہ ذرا ٹھہرنے کا

نہیں ہے آج تمنا کوئی بھی سینے میں
کہ آج میرا ارادہ تھا آہ بھرنے کا

کہاں اب آنکھیں مکلف ہیں خود نگاہی کی
زمانہ اب وہ کہاں آئینوں سے ڈرنے کا

ستارہ بن کے چمکتا رہوں گا صدیوں تک
فلک گواہ رہے گا مرے ابھرنے کا

ابھی بھی میز نے منظر سنبھال رکھا ہے
وہ میری چائے کی پیالی میں غم اترنے کا

دعائیں زیست کی وہ لوگ دے رہے ہیں مجھے
کہ جن کو جشن منانا ہے میرے مرنے کا
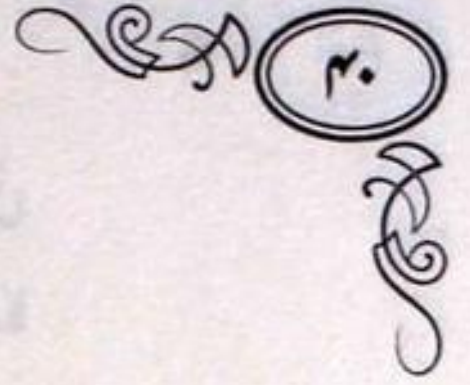
معجزہ یہ دیکھتے رہتے ہیں ہم حیران سے
لوگ جی اٹھتے ہیں کیسے اک تری مسکان سے

درد کی اگتی ہے میری کشتِ جاں میں کاسنی
ہجر مجھ ریشہ خطمی ہے ہزاروں جان سے

یا نہ ان چیخوں کا کوئی درک ہو پاتا ہمیں
یا ہمیں مانوس ہی رکھا نہ جاتا کان سے
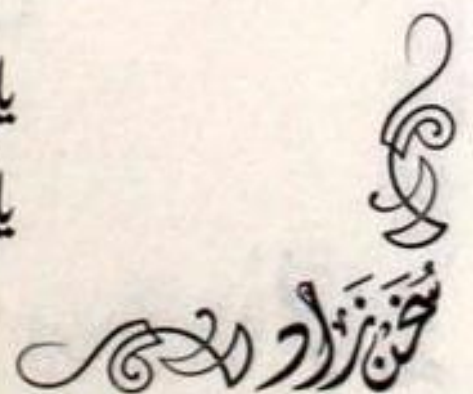
وہ تو کہیے اوڑھ لی پلکوں نے جنبش کی ردا
ہاتھ دھو بیٹھے تھے ورنہ آج ہم ایمان سے

کاش اس کی نیلم و یاقوت سی آنکھوں میں ہم
جھلملا اٹھیں کسی دن لولو و مرجان سے

وہ جو ہوتی تھی محبت نام کی اک شے مکیں
اٹھ گئی ہے کیوں بھلا اس دور میں انسان سے

رم میسّر ہو تو پھر کچھ آہوئے دل کی بنے
کب تلک یوں دشت میں بیٹھے رہیں ویران سے

لمس حاصل تھا کبھی کچھ آتشیں ساعات کا
آج بھی مہکے ہوئے پھرتے ہیں ہم لوبان سے

دکھاتی ہے جو یہ دنیا وہ بیٹھا دیکھتا ہوں میں
ہے تف مجھ پر تماشہ بین ہو کر رہ گیا ہوں میں

بس اتنا ربط کافی ہے مجھے اے بھولنے والے
تری سوئی ہوئی آنکھوں میں اکثر جاگتا ہوں میں

عطا مجھ کو ہوئی ہے رنگ و نکہت کی جہاں بانی
محبت کی مہکتی خاک میں بویا گیا ہوں میں

مری آبادیوں میں چار سو بکھرا ہے سناٹا
حصارِ خوف سے چاروں طرف باندھا گیا ہوں میں

رلاتی ہیں مری یادیں ہمیشہ خون کے آنسو
کسی نادار پہ گزرا ہوا اک حادثہ ہوں میں

مسلسل ہی بڑھائی ہیں کسی کی دھڑکنیں میں نے
مسلسل ہی کسی کے ذہن سے سوچا گیا ہوں میں

وراثت ہوں میں اک ڈھلتی ہوئی تہذیب کی صارمؔ
کہیں کھویا گیا ہوں میں، کہیں پایا گیا ہوں میں

سخت احوال اگر ہم پہ ہوا کرتے ہیں
اپنے جسموں پہ ترے غم ہی ردا کرتے ہیں

آسماں سوتا ہے شب بھر میرے سینے میں کہیں
چاند تارے میری آنکھوں میں جگا کرتے ہیں

اب تو یہ بوجھ سہارا نہیں جاتا ہم سے
چشم کی قید سے اشکوں کو رہا کرتے ہیں

شاخِ گریہ پہ رکھیں آؤ تبسم کے گلاب
درد کا کیا ہے؟ جہاں والے دیا کرتے ہیں

یوں ہی رہتا نہیں موجوں میں تلاطم میرے
مجھ میں دریائے جنوں خیز گرا کرتے ہیں

روزنِ خواب پہ اٹکا کے نگاہیں اپنی
ہم تسلسل سے تری راہ تکا کرتے ہیں

آؤ مل بیٹھیں کسی روز انہیں لمحوں میں
جب افق پار شب و روز ملا کرتے ہیں

پلٹ کر دیکھنے کا مجھ میں یارا ہی نہیں تھا
نہیں ایسا کہ پھر اس نے پکارا ہی نہیں تھا

سمندر کی ہر اک شے پر ہماری دسترس تھی
کہ طغیانی بھی اپنی تھی کنارہ ہی نہیں تھا

وہ اک لمحہ سزا کاٹی گئی تھی جس کی خاطر
وہ لمحہ تو ابھی ہم نے گزارہ ہی نہیں تھا

وہ بن کر چاند تب اترا تھا اس دل کی زمیں پر
محبت کا جب آنکھوں میں ستارہ ہی نہیں تھا

ورائے جسم تھا کچھ اور بھی اس کے جلو میں
فقط وہ روشنی کا استعارہ ہی نہیں تھا

جنوں کے پاؤں میں چھن کیسی در آئی کہ میں نے
ابھی وحشت کو صحرا میں اتارا ہی نہیں تھا

سخن زاد

بخشتی ہے قرب اپنا یوں بھی ویرانی مجھے
راس آتی ہے توحش کی فراوانی مجھے

مستقل رہتا ہے مجھ پر منعکس اک آئینہ
دیکھتی رہتی ہے پیہم ایک حیرانی مجھے

ختم ہو جاتا ہے یکدم عالم ناممکنات
گھیر لیتی ہے یکا یک موجِ امکانی مجھے

کیا کہوں دشوار کتنی ہیں مجھے آسانیاں
کیا کہوں کیسی سہولت ہے پریشانی مجھے

اولاً اک آگ بھڑکائی گئی مجھ خاک میں
اور پھر دیکھا گیا ہوتے ہوئے پانی مجھے

رات دن رہتا ہوں میں آمادۂ رقصِ جنوں
محترم یوں ہی نہیں ہے پا بجولانی مجھے

کیا کیا جائے کہ رکھتی ہے اندھیروں کی غلام
بیشتر اوقات خود اپنی ہی تابانی مجھے

سخن زاد
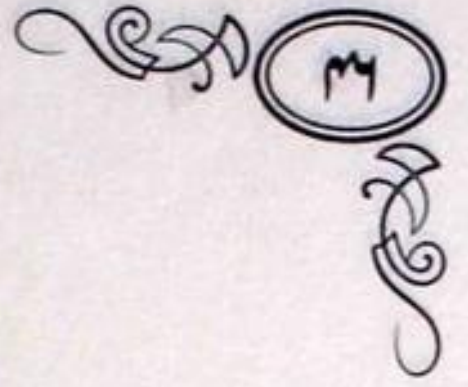
وقت کے تصرف میں یہ گھڑی بھی آئی تھی
رات کی ہتھیلی پر صبح کی کمائی تھی

مستقل میں خود اپنی راہ میں مزاحم تھا
مجھ سے مستقل میری زور آزمائی تھی

کچھ نہ کچھ کہا ہوگا شام کے دھندلکوں نے
بے سبب نہ سورج کی آنکھ ڈبڈبائی تھی

راستوں کے سانپوں نے بارہا ڈسا ہم کو
پر اس اک مسافت میں ایسی دلربائی تھی!!

سرخوشی کی لہریں تھیں اور تھا بدن اس کا
چاند کے ابھرتے ہی جھیل کی بن آئی تھی

آج بھی مہکتی ہیں جسم و جاں کی دیواریں
کیا گلاب لمحے تھے کیسی آشنائی تھی

آنکھ نے چڑھالی تھیں خواب چوڑیاں اتنی
تا دمِ سحر صارمؔ رات چھنکنائی تھی

ہیں کب سے ترے چاک پہ، مرجھائے بدن
تکمیل کی امید لئے آئے، بدن

میں بھی تو سنوں وصل کے نغمات کبھی
مجھ پر بھی کھلے رمزِ سخن ہائے بدن

آوارہ پھرا کرتی تھی یہ روح مری
پھر ایسا ہوا، تیرا چرا لائے بدن

حالات کی آندھی کے مقابل ہوں، مگر
ڈرتا ہوں، نہ اک روز اکھڑ جائے بدن

یوں بھی ہو، سمائیں نہ بدن میں آنکھیں
ایسا بھی ہو، آنکھوں میں سمٹ آئے بدن

اک لحظہ ہی تھا اس کے تصرف میں مگر
میں آج تلک پھرتا ہوں مہکائے بدن

دیکھتا رہ جاتا ہوں میں پیش و پس ہوتا ہوا
خود میں ہر ساعت کوئی کارِ ہوس ہوتا ہوا

قطرۂ عصیاں، کنارِ چشمِ نم، مایوس ہی
آج پھر لوٹا درِ فریاد رس ہوتا ہوا

کوندتی ہے آنکھ میں پھر سے کلس کی روشنی
دھیان پھر محوِ طلسماتِ جرس ہوتا ہوا

تھا کسی کی یاد کا جھونکا، سو کھلنا ہی پڑا
غنچۂ افکار سے گذرا تھا مس ہوتا ہوا

ہر گھڑی ہوتی ہوئی تحلیل مجھ میں زندگی
اور میں ہر آن ہی صرفِ نفس ہوتا ہوا

دستِ بت گر نے مجھے گوندھا ہے تیری خاک میں
ہوں تری تقویم کا باعث میں خس ہوتا ہوا

آخرش یہ سوچ کر میں ہو گیا ہوں مطمئن
دو جہاں میں کب ہے صارمؔ کچھ عبث ہوتا ہوا

دو چار ستارے ہی مری آنکھ میں دھر جا
کچھ دیر تو اے ساعتِ شب مجھ میں ٹھہر جا

اب اور سنبھالی نہیں جاتی تری حرمت
یوں کر غمِ جاناں میری نظروں سے اتر جا

تا عمر ترا نقش فروزاں رہے مجھ میں
اک زخم کی صورت مرے ماتھے پہ ابھر جا

چھوڑ آنا وہیں اپنی یہ آوارہ مزاجی
صحرا کی طرف اے! دلِ نادان اگر جا

یا ہو جا تو دریا کی نگاہوں میں ترازو
یا تشنہ لبی ساتھ لیے جاں سے گزر جا

جب ذہن کو سننی ہی نہیں تیری دلیلیں
دل تو بھی رسوماتِ تفاہم سے مکر جا
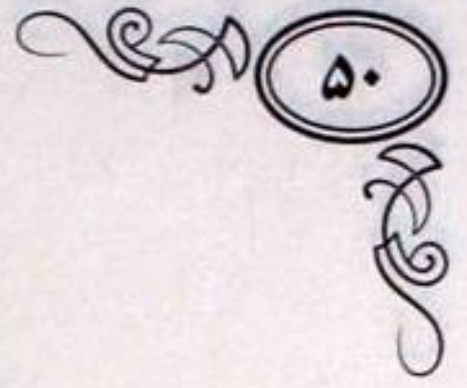
جانے کیا! جانے کی اس کو جلدی تھی
میرے بنا ہی وقت کی گاڑی چل دی تھی

ویرانی تھی اُس لڑکی کی آنکھوں میں
اور بدن پر چندن ہاتھ پہ ہلدی تھی

پہلے میں بھی اہلِ خرد میں شامل تھا
پھر اک عشق نے میری راہ بدل دی تھی

اب کے اس نے دریا ہم کو خشک دیے
جس نے پچھلی بار زمیں جل تھل دی تھی

آج بھی گھر سے نکلے تو دو ہاتھوں نے
پیشانی پر خاکِ دعا کی مل دی تھی

وہ بھی جیسے رونے پر آمادہ تھا
میں نے بھی تو اپنی آنکھ مسل دی تھی

ورنہ میں مرجاتا اِس خاموشی سے
شکر کہ اس نے پہلو میں ہلچل دی تھی

ہوا کا زور بھی اور دیپ کی امامت بھی
رہے نظر میں ہتھیلی کی استقامت بھی

تھی منکشف اسی ساعت تری کرامت بھی
یہ اور بات وہ ساعت تھی اک قیامت بھی

مرید ہوتے ہیں جو میری کج کلاہی کے
وہی لٹاتے ہیں مجھ پر گلِ ملامت بھی

کچھ ان کے چہرے بھی تزئین سے گریزاں ہیں
کچھ آئینوں نے گھٹالی ہے اپنی قامت بھی

تُو دیکھتا تو گزرگاہِ معصیت سے پرے
وہیں کہیں پہ پڑی تھی رہِ ندامت بھی

ہو حسنِ خواب سے مملو اگر عبارتِ چشم
تو بار ہوتی نہیں رات کی ضخامت بھی

اضطراب ایسا ہوا دل کا سہارا مجھ کو
کوئی ٹھہراؤ نہیں خود میں گوارا مجھ کو

سر اٹھاتی ہے وہ تجدید کی خواہش مجھ میں
نقش گر سوچنے لگتا ہے دوبارہ مجھ کو

میں تہی دست کھڑا تھا سرِ صحرائے حیات
آرزو نے تری یک لخت پکارا مجھ کو

جا پہنچنا کسی رفعت کو نہیں ہے دشوار
ہاں! ٹھہرنے کا وہاں چاہیئے یارا مجھ کو

دیکھ اے! میری زبوں حالی پہ ہنسنے والے
وقت کی دھوپ نے کس درجہ نکھارا مجھ کو

وقت کو جانے بنانا ہے مجھے کیا صارمؔ
گردشِ چاک سے اب تک نہ اتارا مجھ کو

سوادِ چشم میں حیرت اُگائیے تو سہی
خود اپنے روبرو اپنے کو لائیے تو سہی

تمام رونقیں اُتریں گی اِس خرابے میں
جنوں کی، دشت میں دھونی رمائیے تو سہی

تماشہ دیکھے یہ دنیا بھی آب و آتش کا
ہماری آنکھوں سے آنکھیں ملائیے تو سہی

کچھ اور میوے لبِ عشق پر رکھے جائیں
پرانے بوسوں کے ملبے اٹھائیے تو سہی

پھر آپ ڈھونڈتے رہیے نشان زخموں کے
ہماری راکھ بدن پر لگائیے تو سہی

اِسی زمین سے اُٹھیں گی کہکشائیں بھی
بفیضِ اشک اسے نم بنائیے تو سہی

ہمارے لفظ اجالوں سے کم نہیں صارمؔ
انہیں لبوں پہ شبِ غم سجائیے تو سہی

سخن زاد

سانسوں کو اعتبار عطا کر دیا گیا
مجھ میں کسی کا عشق خدا کر دیا گیا

آنکھیں ہماری نورِ بصیرت سے بھر گئیں
ہم پر ترا خیال ردا کر دیا گیا

بس ڈوبنے ہی والے تھے خوابوں کے قافلے
دریا سپردِ ضربِ عصا کر دیا گیا

اک میں کہ محوِ یاس ہوں در پہ پڑا ہوا
اک وہ کہ ان کو گھر سے بلا کر دیا گیا

ورنہ رہِ حیات نہ مشکل تھی بس ہمیں
پابستۂ نقوشِ وفا کر دیا گیا

رگ رگ میں بھر دیا گیا احساس کا نمک
زخموں کو جسم و جاں کی قبا کر دیا گیا

دل مائلِ طلب تھا بہ آئینۂ سکوت
اک شور اور مجھ میں بپا کر دیا گیا

گلاب نت نئے ہم زینتِ سبد کئے جائیں
بدن کو زخمِ مسلسل یوں ہی رسد کئے جائیں

سنا ہے چھایا ہے اس پر صنوبری موسم
سو خود کو آؤ چلو ہم بھی سروقد کئے جائیں

بلند ہونا ہمارا کوئی کمال نہیں
کمال ہو جو زمینیں ہمیں وَتَد کئے جائیں

تو پھر کہاں سے ہو قائم فضائے امن و اماں
چراغ خود ہی اندھیروں کی جب مدد کئے جائیں

الجھ کے رہنے سے بہتر ہے ان لکیروں میں
ستارے اپنی جبینوں کے مستند کیئے جائیں

وہ دن بھی زیست تجھے دیکھنا مقدر ہو
عنایتیں تری جب ہم تمام رد کیئے جائیں

سدا اترتی رہیں آیتیں محبت کی
ہم ان کا ورد سدا مہد تالحد کیئے جائیں

دیے ہیں ہاتھ تو پھر کر انھیں ہنر بھی عطا
ملی ہیں آنکھیں تو پھر خواب بھی سند کیئے جائیں

جنون والوں کا اثبات ہے یہی صارمؔ
کہ وہ خرد کے حوالوں سے مسترد کیئے جائیں
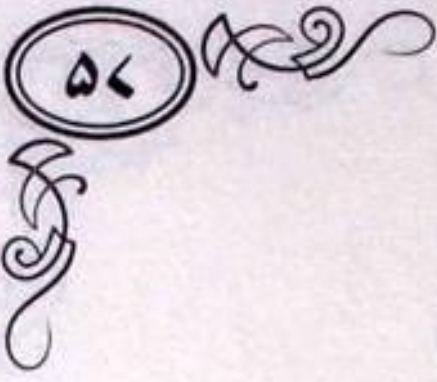
فنا ہوا تو میں تارِ نفس میں لوٹ آیا
خوشا کہ عشق تری دسترس میں لوٹ آیا

نہ جانے اس نے کھلے آسماں میں کیا دیکھا
پرندہ پھر سے جہانِ قفس میں لوٹ آیا

کسی کے جبر میں کتنا تھا اختیار مجھے
برا کیا کہ جو میں اپنے بس میں لوٹ آیا

یہ حاشیے ترے گمراہ کر رہے تھے مجھے
کتابِ زیست سو میں تیرے نص میں لوٹ آیا

وہ دل خراش تھا آئندہ سال کا منظر
میں الٹے پاؤں گزشتہ برس میں لوٹ آیا

کہکشاؤں نے رفاقت کا ارادہ باندھا
شوق نے جب بھی مرے پاؤں سے جادہ باندھا

اوڑھنی سر پہ رکھی فکر نے رنگوں والی
حرف نے جسم پہ خوشبو کا لبادہ باندھا

بارہا ملتا رہا مجھ کو محبت میں فریب
بارہا میں نے محبت کا اعادہ باندھا

اس لئے دور سے مذہب کی خدا نے ہم کو
ذہن و دل راہ بھٹک جائیں مبادا، باندھا

سخن زاد

مل گئی مجھکو جہاں بھر کی غلامی سے نجات
جب ترے عشق کا گردن میں قلادہ باندھا

اپنی وسعت کے مطابق ہی عطا ہے اس کی
اس نے کب ہم پہ ضرورت سے زیادہ باندھا

دیر تک پھر اسے شہ دینے کی جرآت نہ ہوئی
میں نے جب حکم کے اطراف پیادہ باندھا

کیوں بھلا بیٹھا ہے انساں کہ دمِ روزِ الست
تھا کوئی اس نے درِ پاک سے وعدہ باندھا

رات کی تیرہ ہتھیلی پہ یہ کس نے صارمؔ
نور کی تھال میں چاندی کا برادہ باندھا

نت نئے نقش سے باطن کو سجاتا ہوا میں
اپنے ظاہر کے خدوخال مٹاتا ہوا میں

لحظہ لحظہ یہ فدا ہوتی ہوئی مجھ پہ حیات
اور ہر آن نظر اس سے چراتا ہوا میں

جانے کس رت میں کھلیں گے یہاں تعبیر کے پھول
سوچتا رہتا ہوں اب خواب اگاتا ہوا میں

ہر گھڑی بڑھتی ہوئی تشنہ لبی، عشق تری!
دل کے رستے ہوئے زخموں سے بجھاتا ہوا میں

روز ہوتا ہوا مجھ میں کسی خواہش کا جنم
روز ہی قبر نئی خود میں بناتا ہوا میں

رہروِ شوق کرو یوں! مرے پیچھے آؤ
آؤ چلتا ہوں تمہیں راہ دکھاتا ہوا میں

آج بھی یاد ہیں صارم کو مناظر سارے
ہر ادا پر وہ تری جان سے جاتا ہوا میں

کسی کا عشق مری ذات پر حصار ہوا
پھر اس کے بعد ہی میں معتبر شمار ہوا

کھلے تھے در تو نہ تھی روشنی کی کوئی کرن
چراغ اترنے لگے جسم جب مزار ہوا

وفا، خلوص، محبت، شعور، فکر و نظر
میں بے شمار حوالوں سے مستعار ہوا

گلِ سکون سرِ دامنِ وصال کہاں؟
خوشا کہ دل یہ رہینِ فراقِ یار ہوا

مرا سفر کوئی آسان تو نہ تھا اے دوست
میں پربتوں سے جو گزرا تو آبشار ہوا

میں اک سخن کہ جو تفہیم کو ترستا رہا
ترے لبوں پہ اترتے ہی شاہکار ہوا

چھپائے رکھتا کہاں تک اُسے جزیرۂ چشم
وہ آشکار ہوا اور ستارہ وار ہوا

روشن ہماری شام کہاں ہے چراغ سے
اک لَو اٹھی ہوئی ہے ہتھیلی کے داغ سے

ساعت وہ جیسے ٹھہر گئی ہے بہ چشمِ وقت
شرمندہ جب ہوئے تھے مرے لب ایاغ سے

پھل چکھ کے چھوڑ دینے کی عادت بری سہی
لیکن گلہریوں کو بھی نسبت ہے باغ سے

پایا گیا نہ خود کو جب اپنے وجود میں
پھر ہاتھ اٹھا لیا گیا کارِ سراغ سے

بیٹھا ہوا ہے آج کبوتر کے درس میں
کل مشورہ کناں تھا یہی طَیرِ زاغ سے

اک پھانس ہے کہ اٹکی ہوئی ہے درونِ صدر
اک جونک ہے کہ چمٹی ہوئی ہے دماغ سے

اب فرصتیں کہاں کہ تجھے سوچتے پھریں
وہ دن گئے جو رکھتے تھے رشتہ فراغ سے

میں اپنے آپ سے واقف ذرا نہیں ہوتا
جو میری ذات پہ وہ آئینہ نہیں ہوتا

شجر کے پاؤں دھلاتی نہ موج دریا کی
زمیں سے اس کا اگر واسطہ نہیں ہوتا

ہزار جانیں لٹاتے پھریں مگر پھر بھی
ہماری جان کا صدقہ ادا نہیں ہوتا

بزرگ شاخ سے دو پل مکالمہ کر لیں
نئے پرندوں میں اب حوصلہ نہیں ہوتا

تمام شہر کی خبریں یہیں پہ چھپتی ہیں
ہمارے چہرے پہ کیا کچھ لکھا نہیں ہوتا

کہیں کہیں پہ تو پتھر بھی بول پڑتے ہیں
کبھی کبھی تو خدا بھی خدا نہیں ہوتا

ہوا بھی ہاتھ میں تلوار تھام لیتی ہے
دیے کے دل میں اگر حوصلہ نہیں ہوتا

کش مسلسل لیجئے تو زندگی آسان ہے
ورنہ اس سگرٹ کے بجھنے کا قوی امکان ہے

دو جبینوں پر ہی سجتے ہیں ستاروں کے نقوش
اک فلک کا کینوس، اک آنکھ کا دالان ہے

یوں ہی آمادہ ہوئے ہیں ہم پئے غارت گری
جیسے اپنے واسطے غارت گری 'نروان' ہے

تا سرِ خاکِ بدن از دامنِ صحرائے جاں
ہر قدم پر آرزوؤں کا نیا شمشان ہے

اف! وہ سر جس میں سمائی ہیں عقیدت مندیاں
ہائے! وہ سینہ کہ جس میں مہر کا فقدان ہے

کیا! کہ کرتا ہے مسلسل مجھ سے تو پہلو تہی
پر نمو کا، خاک میں میری جو اک امکان ہے

نقوشِ حرفِ گزشتہ سبھی مٹا دوں گا
کتابِ زیست کو عنوان پھر نیا دوں گا

وہ اک تضاد جو ہم دونوں کا تشخص ہے
اسی تضاد کو میں ربط کی بنا دوں گا

نہ کچھ ہوا تو شبِ غم تری ہزیمت کو
چراغِ دل سرِ طاقِ بدن جلا دوں گا

اب انہدام کوئی اور اگر ہوا مجھ میں
تو پھر یہ ضبط کی دیوار بھی گرا دوں گا

تم ایک بار سنورنے کی آرزو تو کرو
میں اپنے آپ کو آئینہ رو بنا دوں گا

نہ مجھ فقیر کے آگے یوں ہاتھ پھیلاؤ
ہے میرے پاس بھلا کیا، میں تم کو کیا دوں گا

نگاہِ شوق میں ٹھہرا ہوا جنوں، میں تھا
ہوا نہ وقت کے آگے جو سرنگوں، میں تھا

کچھ ایسا مجھ کو ہوا اس کی پیروی سے شغف
وہ اپنی ذات میں 'کن' تھا، تو پھر 'یکوں' میں تھا

جوازِ روح، مرے بعد بھی ہے کیا تجھ میں!
تری رگوں میں جو بہتا تھا بن کے خوں، میں تھا

کسی کی تال سے اٹھتی ہوئی چھنک تھا میں
کسی کی سر سے بکھرتا ہوا فسوں میں تھا

یہ سوچتی ہے مری خود سپردگی، اے عشق!
ابھی تلک تری تحویل میں نہ کیوں میں تھا

اسی کے ذہن سے معدوم ہو گئے مرے نقش
کہ جس کے دل کے لئے جذبِ اندروں میں تھا

سخن زاد

کیا کہوں کتنی اذیت سے نکالی گئی شب
تری قربت سے وہ اک ہجر بنا لی گئی شب

پہلے ظلمت کا پرستار بنایا گیا میں
اور پھر میری نگاہوں سے اٹھا لی گئی شب

مستقل مجھ میں رہیں چاند ستارے روشن
میری مٹی میں طبیعت سے ملا لی گئی شب

ختم ہوتا ہی نہیں سلسلہ تنہائی کا
جانے کس درجہ مسافت میں ہے ڈھالی گئی شب

فصل مقصود تھی صارمؔ ہمیں سورج کی جہاں
حیف ہے ان ہی زمینوں پہ اگا لی گئی شب
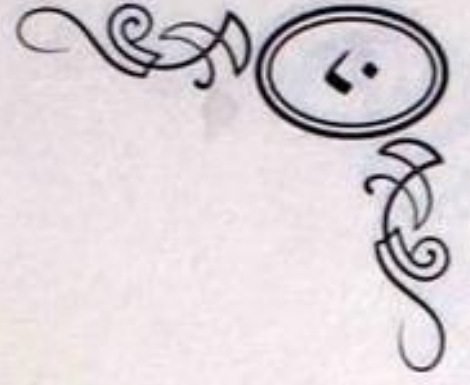
خوش نہ ہو عارضی بحالی پر
پھول کچھ روز ہی ہیں ڈالی پر

میری آواز کے پرندے کو
کاش اگ آئیں کچھ بلالی پر

معرکے وہ بھی سر کیے ہم نے
منطبق تھے جو لا محالی پر

کیا کہ بادِ الم کے چلتے ہی
پھڑ پھڑانے لگے ملالی پر

آنکھ رولی گئی ہے کھیتوں میں
خواب کھلنے لگے ہیں بالی پر

استراحت اتر گئی مجھ میں
ہونٹ رکھتے ہی شب کی پیالی پر

لا کے رکھ دیتی ہے دعا کوئی
روز اک پھول دستِ خالی پر

فکر میں ڈوبا ہوا جھیل سا گہرا اسلوب
کسی آیت سا ترا دل پہ اترتا اسلوب

سوچتا ہوں تو چٹک اٹھتی ہیں دل کی کلیاں
وہ ترا پھول سا لہجہ وہ شگفتہ اسلوب

پھر مرے دل میں سمٹ آیا ہے وحشت کا جہاں
پھر مرے جسم نے اپنایا ہے، صحرا اسلوب

اوڑھنی سے تری موسم نے چرایا ہوگا
رقص کرتا ہوا، یہ رنگ برنگا اسلوب

میری پاکیزہ محبت کا اثر ہے، جس سے
تیرے کنگن کو میسر ہے کھنکتا اسلوب

تشنہ لب پھرتے ہیں الفاظ مرے چاروں طرف
میں نے یوں ہی تو نہیں رکھا ہے دریا اسلوب

زیب کر لیتی ہیں چاندی مری آنکھیں صارمؔ
دیکھتے ہی تیرے کانوں کا سنہرا اسلوب

سخن زاد
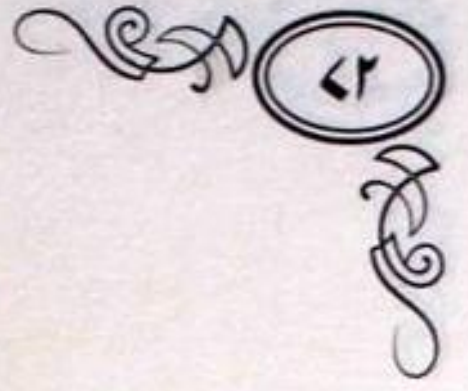
ہوں کسی چشمِ رہنما کا ہدف
ورنہ رہ پاؤں یوں چراغ بکف

میرا دامن پکڑ کے چلتی ہیں
مجھ سے ایسا ہے مشکلوں کو شغف

مشک اٹھی ہے ایک مدفن سے
ایک آہو چلا ہے سوئے نجف

یوں مجسم ہوں غم کے ہاتھوں میں
جیسے قطرہ کوئی بقیدِ صدف

جتنے موتی تھے چن لئے اس نے
میرے حصے میں رہ گئے ہیں خذف

وقت نے آنکھ مار دی ورنہ
زندگی آ رہی تھی میری طرف

پھر دیے جل اٹھے ہیں پلکوں پر
پھر ہوائیں بجا رہی ہیں دف

اک ترے عشق کی کرامت سے
مجھ کو حاصل ہوا ہے عز و شرف
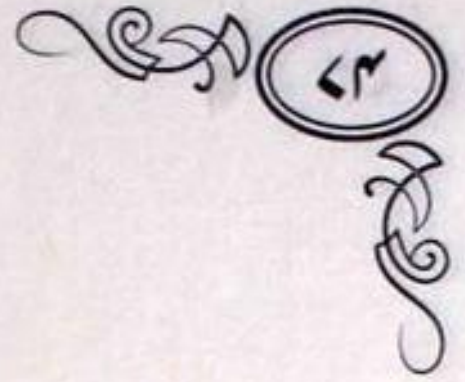
کاش یہ سوچتی پھرتی ہوئی افلاک پہ خاک
اک نہ اک روز تو پڑ جانی ہے اس خاک پہ خاک

سوچتا ہوں نہ ابل آئے اسی راہ لہو
ڈالتا رہتا میں دیدۂ نمناک پہ خاک

منحرف اپنی ہی تقویم سے یوں ہے انساں
خاک پوشاک کو معیوب ہے پوشاک پہ خاک

کوزہ گر ہاتھ نے کچھ بوندیں ہی چھڑکی تھیں ابھی
ایک مہکار سی بکھرانے لگی چاک پہ خاک

مجھ میں بجتے تھے کبھی لالہ و گل، ماہ و نجوم
کیا کہوں! کیوں ہے برستی مری املاک پہ خاک

اپنی ہستی سے ہی بیگانہ جو رکھے صارمؔ
خاک اس عقل پہ، اس فہم پہ، ادراک پہ خاک

سخن زاد

بے طلب انفس و آفاق میں رکھے ہوئے ہم
خاک ہو جائیں نہ یوں خاک میں رکھے ہوئے ہم

کل ہمیں ہونا ہے ایامِ سہولت کا امین
آج ہیں عرصۂ سفاک میں رکھے ہوئے ہم

اک طرف ان سے نمو پاتی ہوئی کشتِ سموم
اک طرف سینۂ تریاق میں رکھے ہوئے ہم

جگمگا اٹھتے ہیں پلکوں پہ ستاروں کی طرح
وقت کی چشمِ المناک میں رکھے ہوئے ہم

کب تلک خاک میں رکھ پاتے نمی کو محفوظ
مدتوں دائرۂ چاک میں رکھے ہوئے ہم

اب ہمیں بام پہ ہونا ہے فروزاں صارمؔ
گم نہ ہو جائیں کہیں طاق میں رکھے ہوئے ہم
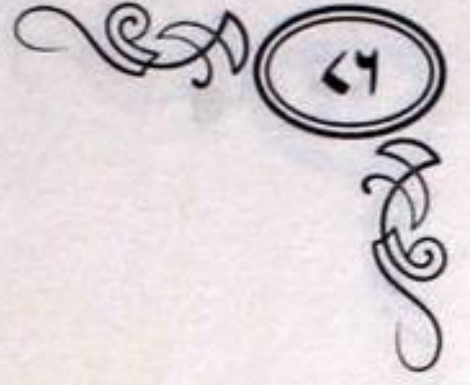
وحشتیں یوں ہی مری خاک میں رقصاں تو نہیں!
میں کسی دشتِ بلاخیز کا عنواں تو نہیں؟

ڈور اک عشق کی جسموں سے بندھی ہے ورنہ
زیست کے پل سے گزرنا کوئی آساں تو نہیں!

کیا ضروری ہے کہ ہم پر بھی زلیخائی ہو
یوسفی اپنی شریکِ مہِ کنعاں تو نہیں!

سُخن زاد
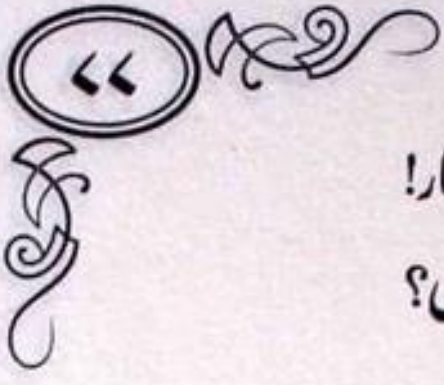
یہ اچانک ہی تری مجھ پہ عطاؤں کی بہار!
تو! حقیقت میں مری ذات سے نالاں تو نہیں؟

بوسہ لیتی ہے مجھے آج بھی اک نقرئی دھوپ
آج بھی صبح مری اشک بہ داماں تو نہیں؟

دامن ارض لہو بار کیا ہے اِس نے
یہ کوئی اور ہی مخلوق ہے انساں تو نہیں!

نارسائی کی نئی لہر اٹھی ہے دل میں
برسرِ چشم کسی خواب کا امکاں تو نہیں!

پہلے اس سینۂ خالی میں وہ اک عشق اتار!
اور پھر دیکھ! خدا حرزِ رگِ جاں تو نہیں؟

گستا ہی رہ نہ جائے کہیں تو کمان کو
پر تولنے لگا ہے پرندہ اڑان کو

کیا جانے کس امید پہ کاسہ بدست آنکھ
مایوس ہو کے تکنے لگی آسمان کو

آب و ہوا کا خاص تناسب بھی چاہیئے
اِس آگ میں گندھے ہوئے خاکی مکان کو

پھر سمت رو نہ ہوگی بھلا رات کی سیاہ
مدت سے ڈھو رہی ہے دنوں کی تھکان کو

کیا روز روز بھیجنا خوابوں کی طشتری
آنکھیں ہی پیش کر دی نہ جائیں یہ، دان کو

جاری رہے نگاہوں کا یوں ہی معانقہ
ہم اور طول دینے لگے داستان کو

بازار کا بھی سوچ لیں اک پل کو یہ ذرا
پیہم بڑھا رہے ہیں جو اپنی دکان کو

کب جی سکے ہیں ٹھیک سے ہم اپنے حال میں
الجھا رکھا ہے زیست نے خواہش کے جال میں

مجھ میں وہ انتظار کی شدت ہے موجزن
آنکھیں اگی ہوئی ہیں مرے بال بال میں

ہالہ ہے مچھلیوں کا ابھی تک بنا ہوا
اترا تھا ایک چاند گھڑی بھر کو تال میں

اب اس کے بعد صرف زیاں ہے وجود کا
اب آ گیا عروج کا نقطہ ابال میں

یہ لو! ابھی سے رقص کناں ہو گئی غزل
گھنگرو ابھی تو باندھے ہیں پائے خیال میں

گرتا ہوں آبشار کی صورت چٹان پر
میں بے سبب تو رہتا نہیں ہوں اچھال میں

نیرنگیاں ہی زیست کو دیتی ہیں اعتبار
رہنا ہے سو مجھے بھی عروج و زوال میں

کیا جانے کب دکھائے گا مرہم ترا اثر
تاخیر ہو رہی ہے مرے اندمال میں

وہ حال ہے کہ خود سے ہی لگتا ہے ڈر مجھے
حیواں چھپا نہ بیٹھا ہو انساں کی کھال میں

غموں کی جس کو ہر اک آن جستجو، مرا دل
وہ جس نے عشق کی رکھی ہے آبرو، مرا دل

خلوص و مہر کی خوشبو بکھیرتا جائے
جوارِ شہرِ جفا میں چہار سو مرا دل

مرے وجودِ شکستہ کی زندگی کی دلیل
یہ میرے دشت بدن میں اک آبجو مرا دل

بوجہِ رشک رخِ گل سبھی تھے پژمردہ
کچھ اس ادا سے ہوا میرے روبرو، مرا دل

ہے ذرہ ذرہ مری کائنات کا رنگیں
ہوا ہے جب سے تو اے جانِ آرزو! مرا دل

قدم قدم پہ ملیں ٹھوکریں زمانے سے
قدم قدم پہ ہوا ہے لہو لہو مرا دل

مرے لئے ہے مری ذات میکدہ صارمؔ
شرابِ فکر ہے میری، تو ہے سبو مرا دل

دلا! جتن کوئی! اے میرے ناخدائے بدن
یوں لگ رہا ہے کہیں ڈوب ہی نہ جائے بدن

اسی وجود میں جب اسکو دفن ہونا ہے
بھٹکتی رہتی ہے پھر کس لئے صدائے بدن

کسی کی شب کو سحر تاب دیکھنا تھا ہمیں
جلا دئے تھے سو ہم نے بھی شاخہائے بدن

تمام عمر پھرا تشنگی کے صحرا میں
بنایا آہ! کسے میں نے رہنمائے بدن

ہمارا عشق اگر تھا وصال روحوں کا
ہمارے درمیاں آخر کہاں سے آئے بدن

گھرا ہوں بحر سے ظلمات کے تو کیا صارمؔ
ہے نور میرے لئے میری خاک نائے بدن

سخن زاد

دل میں اب جذب کا عالم بھی چلا آئے گا
آگیا ہے جو جنوں رم بھی چلا آئے گا

بند رکھتا ہوں سرِ شام دریچہ دل کا
رات کے ساتھ ترا غم بھی چلا آئے گا

تخم ریزی کا ارادہ بھی تو رکھا جائے
ہم میں اک روز کوئی نم بھی چلا آئے گا

اس تفاوت میں ہی پوشیدہ ہے تعبیرِ حیات
آج ہے زیر تو کل بم بھی چلا آئے گا

جھومتی گاتی بہاروں کی نوید آئے گی
رقص کرتا ہوا موسم بھی چلا آئے گا

دھوپ آئے گی تو پھر میری رفاقت کے لئے
میرا سایہ میرا ہمدم بھی چلا آئے گا

وقت کے پیش ڈٹے رہئے کہ صارمؔ اک دن
دوش میں اس کے کوئی خم بھی چلا آئے گا

بس کہ اک لمس کی امید پہ وارے ہوئے ہیں
سو ترے سامنے یہ خاک پسارے ہوئے ہیں

جانے کب ان کو بجھا بیٹھے کوئی بادِ الم
سرِ مژگانِ تمنا جو ستارے ہوئے ہیں

زندگی تو بھی ہمیں ویسے ہی اک روز گزار
جس طرح ہم تجھے برسوں سے گزارے ہوئے ہیں

نت نئے نقش کریں اس پہ اذیت کے رقم
آ کہ ہم تختیِ دل اپنی پچارے ہوئے ہیں

کب بکھر جائیں کسی پاؤں سے ہم برگ وجود
وقت کی دھوپ میں ویسے ہی کرارے ہوئے ہیں

جانتے ہیں کہ تو ہی عشق بدن کو ہے لباس
ہم ترا روپ جو آشفتگی دھارے ہوئے ہیں

اپنی جرأت کی ستائش ہو کہ ہم چوب مزاج
ربط رکھتے ہیں سدا ان سے جو آرے ہوئے ہیں

بادِ وحشت تھی کہ تھی بادِ فنا، یاد نہیں
کس کی آہٹ سے درِ دل تھا کھلا، یاد نہیں

ایک چنگاری سی اٹھی تھی مرے دل میں کہیں
جسم پھر کیسے ہوا خاک مرا، یاد نہیں

کھو گیا تھا میں کسی اور ہی منظر میں کہیں
کیا سنا میں نے؟ کہا اس نے تھا کیا؟ یاد نہیں

لاابالی سا جو اک شخص مکیں تھا مجھ میں
جانے کب ہو گیا مجھ سے وہ جدا، یاد نہیں

یاد ہے اتنا کہ اندھیر تھا کمرے میں بہت
رکھ دیا کس نے سرِ طاق دیا، یاد نہیں

ایک سائے کے تعاقب میں وہاں پہونچا تھا
پھر ہوا کیا تھا سرِ دشتِ بلا، یاد نہیں

کس کے ہاتھوں تھا لٹا زادِ سفر، کون تھا وہ؟
راہزن تھا، کہ مرا راہ نما، یاد نہیں

محبت میں ہماری کاش اک ایسا بھی عالم ہو
مری آنکھوں میں دریا ہو، ترے ہونٹوں پہ زم زم ہو

حوالے کر دیا جاؤں میں شعلہ بار منظر کے
عجب کیا ہے. جو سازش میں مری رنگوں کی شبنم ہو

وہ جل تھل ہے کہ تاحدِ نظر ہی موجزن ہے تو
کوئی دم اے اداسی! اب تری برسات مدھم ہو

تو پھر خود کو سمیٹوں وسعت افلاک سے اک دن
سلگتی خاک سے میری جو اٹھتا یہ دھواں کم ہو

کبھی یوں ہو کہ نظروں سے مری اوجھل تو ہو جائے
کبھی یوں ہو مری صورت تری آنکھوں میں پیہم ہو

میں تیرا جذر کہلاؤں، تو میرا مد کہا جائے
مرے بھائی کبھی ایسا بھی ہم میں ربط باہم ہو

انہیں کی مابدولت زندگی میں ہے دل آویزی
وہ حسرت ہو، الم ہو، زخم دل ہو، کرب ہو، غم ہو

سخن زاد
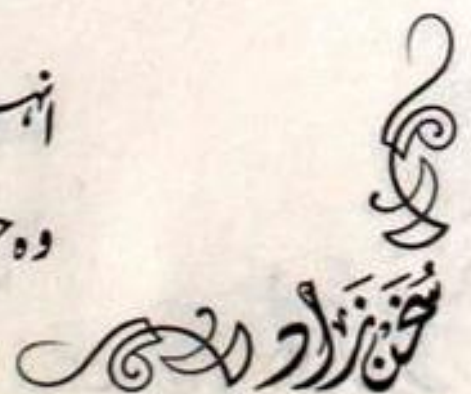
وقت کچھ اور مرے ساتھ گذارو! یارو!!
میری مٹی کو نہ کاندھوں سے اتارو! یارو!!

تم نے اک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا مجھ کو
بارہا میں نے پکارا تمہیں یارو! یارو!!

ایک تم ہی تو ہو تنہائی کے ساتھی میرے
آؤ نا! دور کھڑے کیوں ہو ستارو! یارو!!

غور سے دیکھو! وہ ہے سامنے منزل کا نشاں
یاں تلک آ کے نہ اب حوصلہ ہارو! یارو!!

میں نے کچھ سوچ کے حرمان کو رکھا ہے نصیب
میرا افسوس نہ کرنا مرے پیارو! یارو!!

یہ وہی میں ہوں، وہی صارمؔ آشفتہ مزاج
یوں کفِ چشم نہ حیرت سے پسارو! یارو!!

کیا کہوں کتنا فزوں ہے تیرے دیوانے کا دکھ
اک طرف جانے کا غم ہے اک طرف آنے کا دکھ

ہے عجب بے رنگیِ احوال مجھ میں موجزن
نے ہی جینے کی طلب ہے نے ہی مر جانے کا دکھ

توڑ ڈالا تھا سبھی کو درد کے آزار نے
سہہ نہ پایا تھا کوئی کردار افسانے کا دکھ

خون رو اٹھتی ہیں سب آنکھیں نگارِ صبح کی
بانٹتی ہے شب کبھی جو آئینہ خانے کا دکھ

شمع بھی تو ہو رہی ہوتی ہے ہر پل رائیگاں
کیوں فقط ہم کو نظر آتا ہے پروانے کا دکھ

سر پٹکتی تھیں مسلسل موج ہائے تشنگی
ہونٹ کے ساحل پہ خیمہ زن تھا پیمانے کا دکھ

وار دیتا ہوں میں صارمؔ اپنی سب آبادیاں
مجھ سے دیکھا ہی نہیں جاتا ہے ویرانے کا دکھ

زیست نے مجھ سے بایں طور نبھایا، آہا
والہانہ یوں غموں نے مجھے چاہا، آہا

پھر کسی اور مسیحائی کی حاجت کیا ہو
تو جو رکھ جائے مرے زخم پہ پھاہا، آہا

پھر رہا ہوں سرِ افلاک تفاخر پیہم
اس نے اس طرح مجھے اب کے سراہا، آہا

جبل وارض وسما خوف سے کانپ اٹھے تھے
اور انسان یہ چلا اٹھا، آہا! آہا!

رائیگاں جاتی بھلا کیسے عبادت میری
آخرش بام پہ تو آ گیا ماہا، آہا

آگہی ہے یا اذیت کا تسلسل صارمؔ
سحر آگیں! وہ ترا کیف گناہا، آہا

سخن زاد

زمیں سرخی، زماں سرخی، مکیں سرخی، مکاں سرخی
بایں انداز اگلے جا رہی ہے 'کن فکاں' سرخی

جبیں ٹکرائی ہے سورج نے شب کے آستانے سے
لہو صورت جو چھٹکی ہے کنارِ آسماں سرخی

برس جاتا ہے ساون جب کبھی کشتِ دل و جاں پر
درونِ چشم اگ آتے ہیں ویرانی، دھواں، سرخی

بیاں کرتا ہے قصہ اور ہی منظر وقوعہ کا
مگر اخبار والوں نے لگائی ہے کہاں سرخی

سفیدی ہی سفیدی رقص کرتی ہے رگوں میں اب
گئے وہ دن کہ شریانوں میں ہوتی تھی رواں سرخی

کئی صدیوں سے ہوں بے سمت راہوں کا مسافر میں
مرے قدموں تلے ہوتی رہی ہے رائیگاں سرخی

مسلسل ہی غموں نے دل کے دروازے پہ دستک دی
مسلسل ہی مری آنکھوں میں تھی نوحہ کناں سرخی

ہماری زندگی گویا کہ ہے اک دائرہ صارمؔ
یہ قدرت نے رکھ چھوڑی ہے جس کے درمیاں سرخی

کیف میں اپنے ہی رہتا ہوں میں سرشار بہت
بس اسی بات پہ نالاں ہیں مرے یار بہت

منزلیں دیتی گئیں مجھ کو مسافت کی نوید
مرحلے مجھ پہ گزرتے رہے دشوار بہت

ایسا اثبات بھی تشکیل ہوا ہے مجھ میں
بھر دیا جس نے مری ذات میں انکار بہت

کیا خبر اپنے معانی کو پہونچ پائیں گے
لفظ رکھتے ہیں ہمیں در پئے آزار بہت

اک ترے لمس سے پھوٹی ہیں نمو کی راہیں
خاک ورنہ تھی کہاں میری خوش آثار بہت

اب یہاں پھول کی تصویر لگا دی جائے
داغ کو لے کے پریشان ہے دیوار بہت

روشنی آئے کسی طور مرے آنگن میں
تنگ کرتی ہے مجھے اب یہ شب تار بہت

قفسِ جاں سے تھی دشوار رہائی میری
تھام رکھی تھی محبت نے کلائی میری

سبزۂ حسن کی کرتی ہے حفاظت اب بھی
اس کے اطراف میں پھیلی ہوئی کائی میری

سرِ صحرا جہاں تھم جاتے ہیں وحشت کے قدم
رقص کرتی ہے وہاں آبلہ پائی میری

مجھ میں ہو جاتی ہیں پھر سیکڑوں دنیا آباد
ہوا اگر میرے تصرف میں اکائی میری

زندگی! میں نے ہی پرہیز کیا تھا، ورنہ
تجھ تک ایسی بھی نہ مشکل تھی رسائی میری

اپنی تنہائی کا دینا تھا اسے کوئی جواز
اس نے دیوار پہ تصویر لگائی میری

ہم دیوانے اب کے سارا نظم و نسق چلائیں تو!!
اہلِ خرد کی جانب سے بھی آجاتی کچھ رائیں تو!

مجھ کو عشق فلک میں اڑتے رہنا ہے پھر صدیوں تک
میرے نو آموز جنوں کے بال و پر اگ آئیں تو!

لرزیدہ قطروں کا پلکیں کب تک بوجھ اٹھائیں گی
چھٹکارا مل جائے ان سے آنکھیں موند لی جائیں تو!

دہشت کی پھر ایک نئی تاریخ رقم تو ہونی ہے
انسانوں کی جان سے بھی اوپر ہو جائیں گائیں تو!

رنگ برنگی اس دنیا میں کیا ہو مٹی کی اوقات
میں بھی جی اٹھوں جوان کے ہاتھ مجھے چھو جائیں تو!

اندر کمرے میں خوشبو ہے کس کو ہے معلوم میاں
باہر کی دیواروں پر بھی پھول اگ آئے جائیں تو!

تو کیا اپنی آنکھ اٹھا لوں رستے کی پہنائی سے
کرنے دو، کرتا ہے چھت پر کوّا کائیں کائیں تو!

کیا ہوگا جب عشق سوالی ہو گا اپنی میت پر
کیا ہوگا جب حسن کرے گا آئیں بائیں شائیں تو!

شرم سے سورج، چاند، ستارے بادل میں چھپ جاتے ہیں
بچوں کی لاشوں پر صارمؔ روتی ہیں جب مائیں تو!

شوق سے خواہش تجدید بھی پالی جاتی!
اولیں رسم رفاقت تو نبھالی جاتی!!

نو گرفتارِ اذیت تھا میں کس طرح بھلا
مجھ سے جاگیر غم و رنج سنبھالی جاتی

ہم نے پھر اپنے لہو سے ہی جلایا تھا چراغ
کیا ضروری تھا کہ یہ رات بھی کالی جاتی

بات تھی ایسی کہ جس بات کی ہونی تھی گرفت
بات ایسی بھی نہیں تھی کہ اچھالی جاتی

عین ممکن تھا تعلق کا بھرم رہ جاتا
ان سے دوری جو ذرا اور بڑھالی جاتی

ذہن پسپائی پہ مجبور نہ ہوتا صارمؔ
جو خیالوں کی کمک دل سے منگالی جاتی

روشنی مجھ میں بھر گیا کوئی
میرے اندر اتر گیا کوئی

ایک پل کو نظر اٹھی اس کی
ایک پل میں سنور گیا کوئی

ایک خوشبو کھنک اٹھی مجھ میں
مجھ سے ہو کر گذر گیا کوئی

اپنا اثبات چاہتا تھا میں
مجھ میں انکار بھر گیا کوئی

پھر زمینوں کی چاہ میں صارمؔ
آسماں سے اتر گیا کوئی
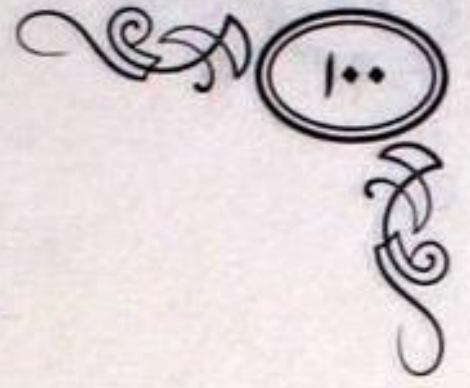
ہر گھڑی مجھ سے ہی کیوں ہے تو سوالی، زندگی!
اور سارے در ہیں کیا سب غم سے خالی، زندگی!

کیسی کیسی راہ کر لیتے ہیں، ہم بھی اختیار
کیسے کیسے خواب دکھلاتی ہے سالی زندگی!

پیکرِ بے جان ہی بہتر تھا میں، مجھ خاک میں
کس لئے اے عشق! تو نے پھونک ڈالی، زندگی

ایک لمحے کے لئے دیکھا تھا بس اس نے مجھے
اور اس لمحے سے ہی میں نے چرالی زندگی

جانے کیوں اکثر ہی یہ احساس ہوتا ہے مجھے
واسطے میرے ہو جیسے کوئی گالی، زندگی

ہم عبث ہی کر رہے تھے عمر بھر سجدہ تجھے
لے تری چوکھٹ سے پیشانی اٹھالی، زندگی!

سخن زاد

خود پر نئی حیات کے در وا کرے کوئی
احساس کی صلیب پہ لٹکا کرے کوئی

موجوں میں بحرِ دل کی بپا کر کے انتشار
مجھ سا کبھی سکون سے بیٹھا کرے کوئی

بے روح لفظیات اگانے کا فائدہ؟
کشتِ سخن میں درد بھی بویا کرے کوئی

چنتا رہا میں اوس کے قطرے تمام عمر
میری طرح بھی پیاس بجھایا کرے کوئی

ڈستا ہے ناگ سا مجھے ہر آن یہ سکوت
محشر مرے وجود میں برپا کرے کوئی

صارم فضا ہے نغمہ سرائی کی منتظر
کاش ایسے میں ہوا کو اشارہ کرے کوئی

رگ و ریشے میں مرے آن بسی ہو جیسے
تیرا احساس کوئی سبز پری ہو جیسے

دیکھ کر منظرِ خوں یوں بھی گماں ہوتا ہے
وقت کے ہاتھ پہ مہندی سی رچی ہو جیسے

ذہن تو ذہن، ٹھہرتا نہیں اک مرکز پر
دل بھی یہ مائل بے راہ روی ہو جیسے

اٹھ رہا ہے مری ہر سانس سے اس طرح دھواں
خانۂ دل میں کہیں آگ لگی ہو جیسے

یوں ہوئی جاتی ہے پر پیچ گزرگاہ حیات
گیسوئے یار کی شوریدہ سری ہو جیسے

روبرو آپ کے رقصاں ہے مری تشنہ لبی
آپ کی ذات کوئی بہتی ندی ہو جیسے

چوم کر ایسے ابھی گزری ہے صارم کو صبا
کان میں چپکے سے اک بات کہی ہو جیسے

ہمارے ہاتھ میں جب اس کا ہاتھ ٹھہرا ہے
ہر ایک ذرہ ہمیں کائنات ٹھہرا ہے

ابھی تو سر پہ مرے آسمان ہے قائم
ابھی تو پاؤں میں میرے ثبات ٹھہرا ہے

نظر نظر میں تری دید کی تمنا ہے
نظر نظر میں ترا التفات ٹھہرا ہے

میں پھول پھول ہوں گلشن میں نغمہ زن اسکے
شجر پہ وہ بھی مرے پات پات ٹھہرا ہے

عجب ہے کیا جو مرے بخت کی سیاہی میں
مرے ہی اپنے چراغوں کا ہاتھ ٹھہرا ہے

میں منعکس تھا کبھی جس کی ذات پر صارمؔ
وہ اپنا عکس لئے شش جہات، ٹھہرا ہے
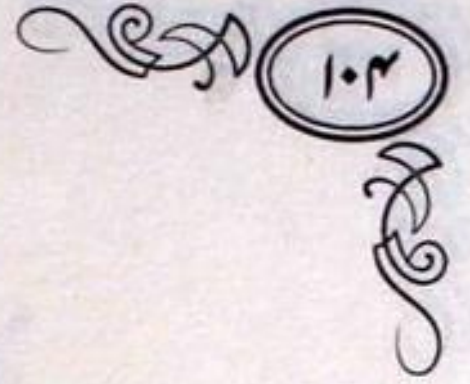
قدم قدم رہِ الفت میں سرخوشی کے لئے
جنوں شعار کیا ہم نے زندگی کے لئے

یہ معجزہ بھی ہوا ہے سرِ دیارِ خلوص
ہوا چراغ بکف ہو گئی کسی کے لئے

مجھے بھی فکر کی مٹھی میں بھر لیا جائے
شکستہ لفظ سے معنی بر آوری کے لئے

پھر ہم نے ربط رکھا آہِ صبح گاہی سے
کرخت ہوتی ہوئی خاک میں نمی کے لئے

مری بجھی ہوئی سانسوں کی راکھ لے جاؤ
یہ کام آئے گی زخموں کی یاوری کے لئے

عجب ہوا ہی چلی ہے کہ محوِ سبقت ہیں
نظر ورانِ سحر، شب کی پیروی کے لئے

وگرنہ اندھے کنوئیں میں بھٹکتے رہ جائیں
خدا شناسی ہے لازم خود آگہی کے لئے

رائیگانی سے خواب کی، ڈر کے
آنکھ رکھ دی گئی ہے تہہ کر کے

رات کی سیڑھیوں پہ بیٹھی ہے
چاندنی آج پھر وضو کر کے

سلوٹوں کا اسے ملال نہیں
رنج کچھ اور ہی ہیں بستر کے

کچھ تو جیتے ہوئے بھی مردہ ہیں
اور کچھ جی رہے ہیں مر مر کے

ہم میں احساس کی رمق بھی نہیں
ہم ہیں گویا وجود پتھر کے

پھر سے اک موجِ تشنگی صارمؔ
پاؤں چھو آئی ہے سمندر کے

مصائب میں ہی ممکن ہے تن آسانی نکل آئے
خزاں کے بعد موسم جس طرح دھانی نکل آئے

تمہیں بھی سیکھنا ہو گا ہنر ضبطِ اذیت کا
یہ کیا کہ ٹیس اٹھی، آنکھ سے پانی نکل آئے

ذرا یہ سوچ! مجھ کو دیکھنے والے حقارت سے
جو میرے آستاں پہ تیری پیشانی نکل آئے

سنا تھا! ہونے والی ہے چمن میں آمد یاراں
سو ہم بھی لے کے اپنی خندہ پیشانی نکل آئے

میں مشکل سے چھڑا پایا ہوں خود کو اس کے چنگل سے
ہوا کے سارے پیکر اب کے جسمانی نکل آئے

لکیریں کھینچتا رہتا ہوں میں یہ سوچ کر صارمؔ
اسی میں کوئی صورت شاید امکانی نکل آئے

سخن زاد
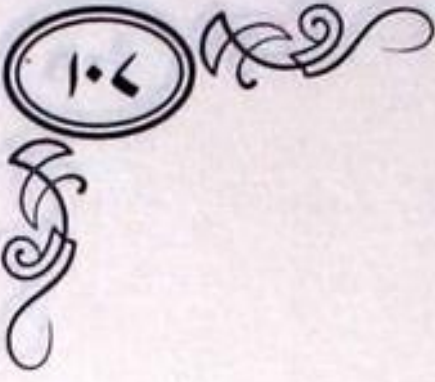
نظامِ شمس و قمر اک ذرا تکلف ہے
یہ روز و شب کا سفر اک ذرا تکلف ہے

جہاں میں اور بھی مخلوق ہیں اطاعت کو
ظہورِ نوعِ بشر اک ذرا تکلف ہے

ہوا کا دوش ہی کافی ہے اپنے ہونے کو
یہ بام و روزن و در اک ذرا تکلف ہے

ہے ان کی ساری توجہ ہماری سمت میاں!
گریز کرتی نظر اک ذرا تکلف ہے

اندھیرا چھٹتا ہے کب وقت کی نگاہوں سے
کرن اگاتی سحر اک ذرا تکلف ہے

یہ کچھ دنوں کے لئے ہم خزاں نصیبوں پر
بہار رت کا گزر اک ذرا تکلف ہے

بدل چکا ہوں میں یکسر، مری طبیعت میں
گئے دنوں کا اثر اک ذرا تکلف ہے

ہمارا جاہ و حشم کب کا مٹ چکا صارمؔ
ہمارے کاندھوں پہ سر اک ذرا تکلف ہے

لبوں تک، تشنگی آنے سے پہلے
گلے ملتی ہے پیمانے سے، پہلے

کشادہ تھی یہ چادر زندگی کی
ہمارے پاؤں پھیلانے سے پہلے

میاں! آساں نہیں کارِ شرافت
ہزاروں دام ہیں، دانے سے پہلے

جھجکتے ہیں نہ جانے خواب کیونکر
ہماری آنکھ میں آنے سے پہلے

اذیت کسب کرتا ہے مسلسل
تخیل شعر کہلانے سے پہلے

چلو! یہ بار بھی منظور، لیکن
ذرا میں پوچھ لوں شانے سے پہلے

عجب خوش رنگیوں کا آسرا تھی
دلوں کی شاخ مرجھانے سے پہلے

اِنھیں میں سمٹی ہوئی اپنی زندگانی ہے
ادھورے خواب ہیں، آنکھیں ہیں، رائگانی ہے

یہ کیا کہ ربط ہواؤں سے مجھ کو رکھنا ہے
چراغ سے بھی مگر دوستی نبھانی ہے

شجر کی آنکھ میں کچھ اور ہی فسانہ ہے
ندی کے لب پہ کوئی اور ہی کہانی ہے

بچھڑتے وقت جو آنکھوں میں تو نے رکھی تھی
مکین مجھ میں یہ حیرت وہی پرانی ہے

ضرور اس کا کوئی چاند سے تعلق ہے
وہ شخص جس کے تعاقب میں رات رانی ہے

بنا کے کھویا ہوا تھا میں اک نیا منظر
ذرا نہ یاد رہا، آنکھ بھی بنانی ہے

مزار لب پہ اگا لی ہے تازگی لیکن
درونِ چشم ابھی سرخوشی سجانی ہے

لکھی گئی ہے جو قرطاس دشت پر صارمؔ
بفیضِ خامۂ وحشت، مری کہانی ہے

جس گھڑی سے وہ شریکِ جسم و جاں بنتا گیا
میں مکاں کی قید میں بھی لا مکاں بنتا گیا

کیا بتاؤں کس خسارے سے ہوا دوچار میں
سود کے سانچوں میں بھی مجھ سے زیاں بنتا گیا

جھلملائی تھی تری تصویر چشمِ فکر میں
ہر طرف میرے محبت کا جہاں بنتا گیا

دن بہ دن ہوتا گیا صحرا بدن میرا وجود
دن بہ دن میں نازشِ آوارگاں بنتا گیا

رفتہ رفتہ مل رہی تھی فکر کو وسعت مری
رفتہ رفتہ میں حقیقت سے گماں بنتا گیا

دو کناروں سے بچھا جاتا تھا میری ذات پر
میں زمیں بنتا گیا وہ آسماں بنتا گیا

ویسے ویسے منہدم ہوتا گیا میرا وجود
جیسے جیسے سر پہ میرے سائباں بنتا گیا

سخن زاد

ندی کے لب پہ کہاں یوں ہی تھرتھری ہوئی ہے
ہماری پیاس عجب آگ سے بندھی ہوئی ہے

کسی کے خواب مری کشتِ جاں میں اگتے ہیں
کسی کی آنکھ مری خاک میں گندھی ہوئی ہے

ہم اس سے قبل فقط خاک کا لبادہ تھے
تمہارے عشق سے اب ہم میں زندگی ہوئی ہے

ڈھلک گئی میرے شانوں سے اختیار کی شال
ذرا سی جبر میں اس کے اگر کمی ہوئی ہے

وہاں وہاں مرے پاؤں نے زخم کھائے ہیں
جہاں جہاں مری آنکھوں میں روشنی ہوئی ہے

ہنوز اپنی منڈیروں پہ جل رہے ہیں دیے
ہوا نے چال کوئی اور ہی چلی ہوئی ہے

اک آئینے کی رفاقت نصیب ہے، ورنہ
رخِ حیات پہ کب ایسی دل کشی ہوئی ہے

کب انبساط میں لفظوں کے پھول کھلتے ہیں
جو دل پہ چوٹ لگی ہے تو شاعری ہوئی ہے

پرندے صلح پہ آمادہ ہو گئے صارمؔ
شجر سے بات ہماری ابھی ابھی ہوئی ہے

زندگی تیرے لئے بار نہ سمجھا جائے
مجھ کو اس طرح بھی بے کار نہ سمجھا جائے

ایک اس کے ہی سبب پائے جنوں کو ہے ثبات
راہ کی دھوپ کو آزار نہ سمجھا جائے

اک نہ اک روز تو سمجھے گی ہمیں یہ دنیا
کیا ضروری ہے ابھی یار، نہ سمجھا جائے

باندھ رکھا ہے ہواؤں نے مری مٹی کو
مجھ کو خوشبو کا گرفتار نہ سمجھا جائے

آخر اس سے ہی تو کھلتا ہے نئی صبح کا در
رات کو آہنی دیوار نہ سمجھا جائے

ہم سے وابستہ ہیں کچھ کارِ مسیحائی بھی
ہم کو اب ایسا بھی بیمار نہ سمجھا جائے

خوشا کہ تیری وضاحت میں کام آتا ہوں
تو کیا ہوا جو فقط حاشیوں پہ لکھا ہوں

عطا ہوا ہے شعورِ مزاحمت مجھکو
چراغ ہوں میں ہواؤں کی زد پہ رکھا ہوں

ادھر کہ بحر کے ہونٹوں پہ بھی مکین ہوں میں
ادھر کہ دشت کی آنکھوں سے بھی ہویدا ہوں

جو مجھ میں آیا ہے اپنا لیا اسے میں نے
میں نہر کو ہوں ندی اور ندی کو دریا ہوں

بپھرتی موجوں سے ہو جاتا ہوں نڈھال جو میں
تو جا کے گہرے سمندر میں ڈوب جاتا ہوں

سخن زاد

تعبیر کے دیوں سے نہ جب لاحقہ رہے
پھر خانقاہِ شب میں کوئی خواب کیا رہے

آنکھیں حروف چومتی جائیں بصد نیاز
اور رحل دل پہ صفحۂ وحشت کھلا رہے

روشن ہے اک دیا جو سرِ شاہراہِ وقت
ممکن ہے کل وہی مری چوکھٹ پہ آ رہے

اک آنکھ جو بہار کی طالب ہو دشت میں
اک دل جو پتھروں میں خدا ڈھونڈتا رہے

اٹھے ندی کے لب سے کوئی موجِ درگذر
کب تک شجر جھکائے ہوئے سر کھڑا رہے

چنتا رہوں میں چشمِ سماعت سے گل حروف
میری خموشیوں میں کوئی لب کشا رہے

یہ کیا کہ آسکے نہ خرد کی پناہ میں
وہ لوگ جو جنوں کے لئے مسئلہ رہے

لازم ہے اس کو لفظ کی حرمت کا ہو خیال
فضلِ خدا اسے جو بھی سخن آشنا رہے

خیالِ یار کی زنجیر سے بندھا ہوا ہے
کہاں پرندۂ دل قید سے رہا ہوا ہے

نہ جانے کتنی بہاروں کا رمز ہے اس میں
یہ ایک پھول جو صحرا میں رونما ہوا ہے

ستارے کب یوں ہی میری زمیں سے اگتے ہیں
کسی کا اشک مری خاک میں گندھا ہوا ہے

خوشا کہ میں بھی سخن کارواں میں شامل ہوں
خوشا کہ حرف سے رشتہ مرا بنا ہوا ہے

میں تیرے سرد رویوں سے ہوں بہت مایوس
مگر یہ دل کہ تری آگ پر مٹا ہوا ہے

بڑے جتن سے جو اظہار تک پہنچتا تھا
مری حریم میں آ کر وہ برملا ہوا ہے

ہوا بھی پل کو تذبذب میں پڑ گئی صارمؔ
دیے کی آنکھ میں منظر کوئی نیا ہوا ہے

مجھ میں ہَوا تھی ایسی ہی رقصاں تمام عمر
رکھا تھا جس نے خاک بداماں تمام عمر

غافل ہوا تھا ایک ہی ساعت مرا وجود
پھر مجھ سے زندگی تھی گریزاں تمام عمر

حیراں تمام عمر رہا آئنوں پہ میں
یا مجھ پہ آئنے رہے حیراں تمام عمر

طاقِ بدن پہ میرے سجا کر چراغ زخم
رکھا گیا تھا مجھ کو درخشاں تمام عمر

درپیش آ ہی جائے نیا پھر کوئی سفر
کھولا نہیں سو میں نے بھی ساماں تمام عمر

پیشِ نظر ہے میرے بھی اب روئے زندگی
رہنا ہے اب مجھے بھی غزلخواں تمام عمر

ہم کو تھی جگنوؤں سی چمکنے کی آرزو
ہم نے اٹھائے رات کے احساں تمام عمر

یہ خاکی پیرہن اک اسم کی بندش میں رہتا ہے
زمانہ ہر گھڑی ورنہ نئی سازش میں رہتا ہے

اسی باعث میں اپنا نصف رکھتا ہوں اندھیرے میں
مرے اطراف بھی سورج کوئی گردش میں رہتا ہے

میں اک پرکار سا سیار بھی ہوں اور ثابت بھی
جہاں سارا مرے قدموں کی پیمائش میں رہتا ہے

مری آنکھوں میں اب ہے موجزن بس ریت وحشت کی
سمندر اب کہاں پلکوں کی ہر جنبش میں رہتا ہے

سپرد آب یوں ہی تو نہیں کرتا ہوں خاک اپنی
عجب مٹی کے گھلنے کا مزا بارش میں رہتا ہے

تسلط ہے کسی کا جب سے اپنی ذات پر صارمؔ
ہمارا دل بہت آرام و آسائش میں رہتا ہے

وحشتیں جھوم اٹھیں ناچنے گانے لگ جائیں
ہم جو صحرا کی طرف پاؤں بڑھانے لگ جائیں

پھر تری یاد اجالے مرے زخموں کے چراغ
پھر ترے غم مری توقیر بڑھانے لگ جائیں

آؤ دنیا سے مداری کا رویہ رکھیں
جب جہاں چاہیں اشاروں پہ نچانے لگ جائیں

آشنا وجد سے ہو جائے سماعت میری
آیتِ وصل ترے ہونٹ سنانے لگ جائیں

وہ بھی اک روز مرے گھر کا ارادہ باندھیں
اور ہم بھی در و دیوار سجانے لگ جائیں

شوق ہو جائے فقط واقفِ آدابِ جنوں
یہ جو آلام و مصائب ہیں ٹھکانے لگ جائیں

وقت کی زلفیں پریشانی سے پا جائیں نجات
صرف اک بار یہ آ کر مرے شانے لگ جائیں

پیاس ہر ذرۂ صحرا کی بجھائی گئی ہے
تب کہیں جا کے مری آبلہ پائی گئی ہے

قید میں رکھی گئی ہے کہیں تتلی کوئی
کوئی خوشبو کہیں بازار میں لائی گئی ہے

کیا بھلا اپنی سماعت میں گھلے کوئی مٹھاس
وقت کے ہونٹوں سے کب تلخ نوائی گئی ہے

کس کی تنویر سے جل اٹھے بصیرت کے چراغ
کس کی تصویر یہ آنکھوں سے لگائی گئی ہے

ہو گئی جا کے شفق رنگی آفاق میں ضم
کفِ دوشیزۂ دل سے جو حنائی گئی ہے

اٹھ اے بربادِ تمنا کی نئی خواب کنیز
حرمِ چشم میں پھر رقص کو لائی گئی ہے

جڑے ہوئے ہیں پری خانے میرے کاغذ سے
جو اٹھ رہے ہیں یہ افسانے میرے کاغذ سے

کترتا رہتا ہے مقراضِ چشم سے مجھکو
بنانا کیا ہے اسے جانے میرے کاغذ سے

قلم نے نوکِ الم کیا رکھی بہ چشم دل
چھلکنے لگ گئے پیمانے میرے کاغذ سے

رقم کروں بھی تو کیسے میں داستانِ حیات
حروف پھرتے ہیں بیگانے میرے کاغذ سے

ابھی رکھی بھی نہ تھی لو چراغ پر میں نے
لپٹ گئے کئی پروانے میرے کاغذ سے

کدالِ خامہ سے بوتا ہوں میں جنوں صارمؔ
سو اگتے رہتے ہیں دیوانے میرے کاغذ سے

سخن زاد

پھر 'پریم' کی 'رچی' نہ ہو کیوں 'آتم داہ' میں
روڑا جو خود بدن ہو 'سمرپن' کی راہ میں

آنکھیں تھکن کا 'وستر' اتاریں کہ کیا کریں؟
'آسن' کیے ہیں خواب کئی بارگاہ میں

اک تیر بھید بھی چکا مچھلی کی آنکھ کو
اک 'لکچھ' ڈولتا ہے ابھی بھی کڑاہ میں

'پن گھٹ' پہ روز آتی ہیں لہروں کی ٹولیاں
'گاگر' سنبھالتے ہوئے جسموں کی چاہ میں

اک دیپ ہم نے 'رن' میں اتارا تھا اور پھر
'اندھیارے' 'بھومی گت' تھے یہ ہر سو نگاہ میں

'کارن' انہیں کے شوبھا ہے ساری مزار کی
یہ 'دیویاں' غموں کی جو ہیں خانقاہ میں

رکھ کر 'کھڑاؤں' پھر سے 'سنگھاسن' پہ 'دیہہ' کی
'ہردے' چلا گیا ہے 'بنوں' کی پناہ میں

آنکھ کو نم نہیں کیا ہم نے
یہ بھی کچھ کم نہیں کیا ہم نے

وہ تو اچھا ہوا چراغِ انا
اور مدھم نہیں کیا ہم نے

جانے کیا سوچ کر پڑھا ہوا اسم
خاک پر دم نہیں کیا ہم نے

جیت کا جشن بھی منایا نہیں
ہار کا غم نہیں کیا ہم نے

یوں نہ ہو چشمِ آسماں کھل جائے
اپنا ماتم نہیں کیا ہم نے

خاک اس سے جنوں اٹھے جس کو
جادۂ رم نہیں کیا ہم نے

ہماری تشنگی کو آزمایا جا رہا ہے
ہمارے سامنے دریا بہایا جا رہا ہے

میں بڑھتا جا رہا ہوں اک عجب دنیا کی جانب
بدن سے رفتہ رفتہ میرے سایا جا رہا ہے

اجالی جا رہی ہے پھر مرے اندر کی دنیا
مرے باہر چراغوں کو بجھایا جا رہا ہے

اگانے دشت کو ہیں کچھ نئے پودے جنوں کے
گلِ وحشت میں خوں میرا ملایا جا رہا ہے

بہائی جا رہی ہیں خون کی ندیاں کہیں پر
کہیں پر عشق کا قصہ سنایا جا رہا ہے

کہانی ہے بس اتنی سی ہمارے ان پروں کی
کسی کی قید ہے اور پھڑپھڑایا جا رہا ہے

ربط کچھ ایسا نہ تھا ان میں بھی خاص آپس میں
تھے بظاہر جو بدن اور لباس آپس میں

حیف ہے ان کو ہی سونپی گئی تقسیمِ شراب
جن سے بانٹی نہ گئی تھی کبھی پیاس آپس میں

کیوں نہ انساں سے مراعات اٹھا لی جائیں
مشورہ زا ہیں شعیر اور کپاس آپس میں

اک طرف راہ کی تعیین میں مصروف بچیس
اک طرف دست و گریبان پچاس آپس میں

میز تو میز تھی، دامن بھی مکدر تھے بہت
اب کے کچھ ایسے ہی ٹکرائے گلاس آپس میں

سنت نے یوں ہی پڑھایا ہے تقرب کا سبق
پئے تقدیم الجھ پڑتے ہیں داس آپس میں

کشتِ احساس میں اس طرح ملا لیں گے تجھے
اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں اگا لیں گے تجھے

کیا خبر کام کا لمحہ کوئی ہاتھ آ جائے
کاسۂ وقت کسی روز کھنگا لیں گے تجھے

اک فقط تیری توجہ سے ترے پیار تلک
رفتہ رفتہ ہی سہی اپنا بنا لیں گے تجھے

نہ مچا شور امنڈتے ہوئے دریا میرے!
ورنہ عفریت سمندر کے یہ کھا لیں گے تجھے

زندگی! ہم سے تری آنکھ مچولی کب تک
اک نہ اک روز کسی موڑ پہ آ لیں گے تجھے

اس طرح رکھیں گے ہم سجدہ گزاری کی مثال
داغ سا اپنی جبینوں پہ سجا لیں گے تجھے

کام آ ہی گئی صارمؔ تری آشفتہ سری
قافلے عشق کے اب راہنما لیں گے تجھے

جب تک کہ وہ اک نقرئی منظر نہیں ہوتا
شبنم کو پر شوق میسر نہیں ہوتا

اک پھول کہ کھلتا ہے سرِ شاخ مسلسل
اک چاند کہ جو بام پہ اکثر نہیں ہوتا

پھر درد کی دہلیز پہ آ ٹھہری ہے ہستی
دیوار میں ایام کی پھر در نہیں ہوتا

خوابوں کی ہتھیلی پہ سجاتا تھا جسے میں
وہ رنگ اب اس آنکھ میں یکسر نہیں ہوتا

تم تلخ رویوں کا دھواں لاکھ اڑاؤ
شیشہ یہ تعلق کا مکدر نہیں ہوتا

اب اشک کا احسان اٹھاتی نہیں آنکھیں
اب دل بھی تری یاد کا خوگر نہیں ہوتا

یہ دل بھی عجب طفل ہے مکتب میں بدن کے
دھڑکن کا قرینہ جسے ازبر نہیں ہوتا

سرحدِ جاں میں جو اک عالمِ ہو ٹھہرا ہے
میرے میخوارِ محبت کو سبو ٹھہرا ہے

اک حیا بارِ سراپا تھا نگاہوں کا نصیب
آج تک میری بصارت کا وضو ٹھہرا ہے

اب ٹھہرتی ہی نہیں مجھ پہ کوئی گردِ ملال
دل کے آئینے میں جس روز سے تو ٹھہرا ہے

ہم سمجھتے تھے جسے باعث ویرانیٔ جاں
آج وہ گلشن ہستی کو نمو ٹھہرا ہے

ایک خوشبو کہ جو ٹھہری ہے لبوں پر اُس کے
ایک طائر جو سرِ شاخِ گلو ٹھہرا ہے

میں کہ اس دل کی رفاقت سے پریشاں ہوں بہت
یہ مرے سارے محاذوں پہ عدو ٹھہرا ہے

اک حال پر حیات نے رکھا کہاں مجھے
پھر مہرباں ہوگئی نامہرباں مجھے

جب پاس تھے تو بند تھے قربت کے راستے
نزدیک لا رہی ہیں تری دوریاں مجھے

ٹوٹا پڑا ہے کون یہ میرے وجود میں
کس کی سنائی دیتی ہیں سسکاریاں مجھے

پھر دور سے گزر گئی اک آشنا ہوا
پھر بے لباس کر گئیں سرگوشیاں مجھے

یاں کاروبارِ دل میں ہی الجھا پڑا ہوا میں
سونپی گئی تھی سلطنتِ دو جہاں مجھے

جلتا ہوں اعتبار کی مرقد پہ ان دنوں
رکھا ہے زندگی نے یہ لا کر کہاں مجھے

وابستہ مجھ سے کارِ زمیں ہیں تو کیوں بھلا
پھرتا ہے اپنے ساتھ لئے آسماں مجھے

نفس نفس میں اذیت کی انتہا ہوئی ہے
کچھ اس طرح سے ہی مسموم یہ فضا ہوئی ہے

یہ کیوں ابھی سے لہو تھوکنے لگا ہے قلم
ابھی تو صرف کہانی کی ابتدا ہوئی ہے

ہوا کے دوش پہ رکھا ہے آشیاں میں نے
سو بے لباسیٔ طینت مری قبا ہوئی ہے

حیات میری بھی گلیوں کو بخش اپنے قدم
نہ جانے کب سے تو ان سے گریز پا ہوئی ہے

درونِ دل بھی یہاں معرکہ بپا ہے کوئی
بساطِ ذہن بھی جیسے کہ کربلا ہوئی ہے

تو پھر وجود کو ہو جانا ہے مرے پتھر
کہ اس کی چشمِ فسوں ساز آئینہ ہوئی ہے

لحاظ کچھ تو ہو صارمؔ بدن شریعت کا
یہ کیا کہ زیست تمنا کی داشتہ ہوئی ہے

وہ بھی کیا خوب اخوت کا جہاں ہوتا تھا
کرب ذروں کا ستاروں سے عیاں ہوتا تھا

اس نے رکھا تھا سلگتی ہوئی راتوں کا حساب
صبح کی آنکھ میں کب یوں ہی دھواں ہوتا تھا

میں اجالوں سے دھلا کرتا تھا آنکھیں اپنی
جب ترا عشق چراغِ دل و جاں ہوتا تھا

اک صدا ہوتی تھی منظر کسی خاموشی کی
اور اک چپ میں کوئی شعلہ فشاں ہوتا تھا

اوک شفقت کی اچک لیتی تھی پلکوں کے گہر
ان دنوں کب مرے اشکوں کا زیاں ہوتا تھا

رات نے پہنا ہوا ہوتا تھا راحت کا لباس
دن معیشت کی تگ و دو کا سماں ہوتا تھا

تب خوشی تھامے ہوئے چلتی تھی انگشتِ حیات
جب ہتھیلی پہ مشقت کا نشاں ہوتا تھا

سخن زاد
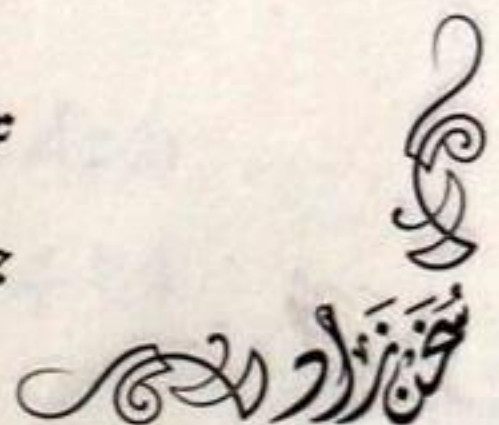
ارشد جمال صارم نئی ادبی نسل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ان کی شاعری کا خمیر موجودہ عہد کی معاشرتی اور معاشی ناہمواریوں کے ساتھ تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی صورتِ حال کے زیرِ اثر تیار ہوا ہے۔ان کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تخلیقی وژن وسیع ہے جو انہیں زندگی سے مکالمہ کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔لہجے کی شگفتگی اور اظہار و بیان کی دلکشی نے انہیں اپنے ہم عصروں میں نہ صرف نمایاں کیا ہے بلکہ انہیں شناخت کا نیا حوالہ فراہم کیا ہے۔

ارشد جمال کی شعری کائنات میں حیرتوں اور تجسس کی ایک ایسی دنیا آباد ہے جس نے ان کے گہرے شعور و ادراک کو نہ صرف نئی معنویت عطا کی ہے بلکہ ان کی تخلیقی فکر کو بھی نئی دشاؤں میں منعکس کیا ہے۔ارشد جمال نے اپنی تخلیقات کے باطن میں ناممکنات سے امکانات تک کا سفر کیا ہے جس کے نتیجے میں ان کی شاعری نے زندگی کے کینوس پر مختلف رنگوں کی حیرت انگیز اور متنوع تصویریں پینٹ کی ہیں اور میرے نزدیک کسی بھی تخلیق کار کے لئے یہ خصوصیت اس کی کامیابی کی دلیل اور بشارت ہے۔مجھے خوشی ہے کہ ارشد جمال صارم کا شعری سفر اپنی تمام تر تخلیقی ہنرمندیوں اور خلوص کے ساتھ جاری ہے۔ میں ان کے اولین شعری مجموعے کی اشاعت کے لئے انہیں بصمیم قلب مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ان کے خوش آئند مستقبل کے لئے دعاگو ہوں۔

سلیم انصاری، جبل پور

مستقل رہتا ہے مجھ پر منعکس ایک آئینہ
دیکھتی رہتی ہے پیہم ایک حیرانی مجھے

HIDAYAT
Publishers & Distributors
F-155, Hidayat Apartment,
Shaheen Bagh, Jamia Nagar,
Okhla, New Delhi - 110025

₹ 200.00